شذرات

ادارہ سازی اور قومی تعمیر	خورشید احمد ندیم	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۱۲-۱۴)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

ہاتھ اور زبان کی حفاظت	طالب محسن	۱۱
گوہ کی حرمت اور خیرات کے آداب	ساجد حمید	۱۶

دین و دانش

ایمانیات (۱۱)	جاوید احمد غامدی	۱۹

نقطۂ نظر

سی پی ایس انٹرنیشنل ـــــ کسی نئے فتنے کی تمہید؟	عمار خان ناصر	۲۵
چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۶)	پروفیسر خورشید عالم	۲۹

سیر و سوانح

بنی اسماعیل کی تولیت بیت اللہ	خالد مسعود	۵۱
عمر فاروق رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۶۰

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خورشید احمد ندیم

ادارہ سازی اور قومی تعمیر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انسان کے تہذیبی ارتقا کا رخ فرد سے اجتماعیت کی طرف ہے۔ سیاست اور حکومت سے لے کر فلسفہ اور سائنس تک، جو امور پہلے ایک فرد سر انجام دیتا تھا، اب ادارہ کر رہا ہے۔ بیسویں صدی میں شخصی حکومتوں کی جگہ پارلیمنٹ نے لے لی اور ماضی میں اگر سائنس اور فلسفے میں نئی دریافتوں کا سہرا افراد کے سر تھا تو اب یہ کامیابیاں اداروں سے منسوب ہوتی ہیں۔ اسی طرح حکومتوں کی حکمت عملی افراد کی جگہ غور و فکر کے ادارے (Think Tanks) ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ افراد کی سطح پر سوچ بچار کا عمل تھم گیا ہے۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے، لیکن انفرادی بصیرت اب اجتماعی بصیرت میں متشکل ہوگئی ہے۔

گزشتہ چند صدیوں سے انسان کی تہذیبی قیادت چونکہ مغرب کے پاس ہے، اس لیے تمدنی ارتقا کے مظاہر مغربی ممالک میں زیادہ واضح اور مشہود ہیں۔ مسلمان چونکہ اس تہذیبی سفر میں بچھڑے پن کا شکار ہیں، اس لیے ہمارے معاشروں میں قدیم دور کی شخصی گرفت ہر جگہ موجود ہے اور ادارہ سازی ہمارے ہاں ایک روایت نہیں بن سکی ہے۔ سیاست و حکومت کے میدان میں دیکھیے تو چند ممالک کے استثنا کے ساتھ ہر جگہ بادشاہت، آمریت یا پھر پاپائیت ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کا معاملہ بھی یہ ہے کہ وہ کسی منشور پر قائم نہیں، بلکہ افراد سے منسوب سیاسی گروہ ہیں۔ مذہبی جماعتوں اور دینی اداروں میں بھی تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر کہیں شوریٰ کے نام پر کوئی ادارہ موجود ہے تو اس کی حیثیت صرف مشاورتی ہے۔ فیصلہ سازی کا کلی اختیار تنظیم یا جماعت کے امیر کے پاس ہے۔ ایران میں غیر معمولی عوامی تائید کے ساتھ ایک تبدیلی آئی، لیکن وہ بالآخر ایک ایسے نظام میں ڈھل گئی جس میں

ایک فرد واحد، جو فقیہ ہے، ہر ریاستی ادارے پر بالا دست ہے۔ افغانستان میں طالبان کو حکومت بنانے کا موقع ملا تو انھوں نے عہد ملوکیت کے اسی نظام کا احیا کرنا چاہا جس میں خلیفۂ وقت کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ اسی طرح پاکستان میں انتخابات تو ہو رہے ہیں، لیکن طاقت اور اختیار کا منبع ایک فرد واحد ہے۔

پاکستان کے بانی بالخصوص علامہ اقبال اور قائداعظم، اس تمدنی ارتقا سے اچھی طرح واقف تھے، جس سے بیسویں صدی کی ترقی یافتہ دنیا آشنا تھی۔ اس لیے وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ جنوبی ایشیا میں اگر مسلمانوں کی کوئی نئی ریاست وجود میں آتی ہے تو اس میں تشکیل پانے والا نظام یقیناً اس ارتقا کے ادراک پر مبنی ہوگا جو تہذیبی سطح پر آ چکا ہے۔ علامہ اقبال کے فکر میں پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کی بات یا قائداعظم کے ہاں جمہوریت اور شخصی حقوق پر اصرار، اسی بات کو واضح کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے ان کی یہ خواہش یہاں کسی نظام کی صورت میں متشکل نہیں ہو سکی اور ہم بدستور ادارہ سازی کے عمل سے دور ہیں۔ حال ہی میں ۱۹۷۹ء کے حدود قوانین میں ترمیم و تنسیخ سے لے کر تحفظ حقوق نسواں بل تک جو ہنگامہ آرائی جاری رہی، وہ اس المیے کو ایک بار پھر نمایاں کر رہی ہے۔

۲۰۰۲ء کے انتخابات کے نتیجے میں ہمارے ہاں ایک پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ اس پارلیمنٹ میں تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں کی نمائندگی ہے جس میں مذہبی تشخص رکھنے والی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ حکمران جماعت سے لے کر حزب اختلاف کی جماعتوں تک، سب کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھتی ہیں، لیکن تحفظ حقوق نسواں بل پر ان کے طرز عمل نے واضح کر دیا ہے کہ اس دعوے میں کتنی صداقت ہے۔ یہ بل جب قومی اسمبلی میں پیش ہوا تو اسپیکر نے تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل ایک سلیکٹ کمیٹی قائم کی جسے اس پر غور و فکر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جمہوری روایات اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا یہ تقاضا تھا کہ کمیٹی کے اراکین اس پر اظہار خیال کرتے، پھر یہ بل ایوان میں عام بحث کے لیے پیش ہوتا اور اس کے بعد اکثریت اس کے بارے میں جو فیصلہ کرتی، وہ نافذ العمل ہو جاتا۔ پارلیمنٹ کی حاکمیت کو قائم کرنے کی واحد صورت یہی تھی۔ اب ہوا یہ کہ متحدہ مجلس عمل نے اس سلیکٹ کمیٹی کا بائیکاٹ کر دیا۔ حکمران مسلم لیگ نے اس کمیٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجلس عمل سے، پارلیمنٹ سے باہر مذاکرات کا دروازہ کھول دیا اور پھر دونوں نے ایک نئے مسودۂ قانون پر اتفاق کر لیا۔ ہمارے نزدیک ان دونوں جماعتوں کا یہ طرز عمل پارلیمنٹ کی بالادستی کے منافی تھا۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ بل قومی اسمبلی میں پیش ہو گیا تھا تو پھر پارلیمنٹ سے ماورا مشاورت کو کیوں روا رکھا گیا؟ ایسی مشاورت کوئی ممنوع امر نہیں ہے، لیکن حکمران جماعت اگر اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی تو یہ کام بل کو اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ پھر جب مجلس عمل کی نمائندگی سلیکٹ کمیٹی میں

موجود ہے تو یہ مشاورت وہاں کیوں نہیں ہوئی؟ پارلیمنٹ میں کسی مسودۂ قانون کے پیش ہونے کے بعد، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے، ایک نئے مشاورتی عمل کا آغاز دراصل اس ادارے پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ اسی طرح مجلس عمل کی قیادت بارہا یہ کہہ چکی ہے کہ اگر پارلیمنٹ نے ان کی رائے کے برخلاف کسی مسودۂ قانون کو منظور کیا تو اس کے اراکین پارلیمنٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی بالادستی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہے کہ پارلیمنٹ کے اس حق کو تسلیم کیا جائے کہ وہ کثرت رائے سے جو فیصلہ کرے، اسے قانون کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ جو سیاسی گروہ پارلیمنٹ کو یہ حق دینے پر آمادہ نہیں، اس کا یہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ وہ پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھتا ہے۔

مجلس عمل کے موقف کو ایک دوسرے زاویے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دینی مسئلے پر کسی دوسری رائے کو نہ تسلیم کرنے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ تعبیر دین کا اختیار اپنے لیے خاص سمجھتے ہیں اور کسی دوسرے کو یہ حق دینے پر آمادہ نہیں۔ اسی کا نام پاپائیت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ دین کے ساتھ کسی دوسرے گروہ یا فرد کی وابستگی کو شک کی نظر سے دیکھتے اور اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ دینی محکمات کے خلاف بھی کوئی رائے قائم کر سکتا ہے؟ کیا ہماری مذہبی قیادت اس موقف کو علانیہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہے؟ اب دونوں میں سے جو وجہ بھی ہو، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسلامی نظریاتی کونسل کے حوالے سے بھی اسی رویے کا اظہار کیا گیا۔ یہ ایک آئینی ادارہ ہے جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ حکومت اگر کسی معاملے کی دینی تعبیر کے بارے میں کسی الجھن کا شکار ہو گی تو اس ادارے کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں جب یہ سوال پیدا ہوا تو اس ادارے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک علما کمیٹی قائم کر دی گئی۔ اب اس کمیٹی نے جس رائے کا اظہار کیا، اس سے قبل یا اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل سے کسی مشاورت کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک آئینی ادارے پر عدم اعتماد کے مترادف تھا۔

یہ طرز عمل دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ ہم بطور قوم ابھی تک نہ تو اداروں کی اہمیت سے واقف ہیں اور نہ دلی طور پر ان کی حاکمیت کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہم اپنی رائے کی حجیت کو مانتے ہیں اور اس کے سامنے اگر ادارے یا اکثریتی رائے موجود ہو تو انھیں نظر انداز کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ ایک قومی المیہ ہے اور اس بات کو نمایاں کر رہا ہے کہ ہماری قیادت ذہنی طور پر ماضی میں جیتی ہے اور اس کے پاس اس تہذیبی بچھڑے پن کا کوئی علاج نہیں جس سے ہم اجتماعی طور پر دوچار ہیں۔ جب ہم اداروں کی حاکمیت کی بات کرتے ہیں تو یہ شخصی

رائے پر اجتماعی رائے کو فوقیت دینے کا عمل ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ مراد اجتماعی بصیرت کا ہر مظہر حق پر مبنی ہوگا، بلکہ اس سے اجتماعی سطح پر اختلافات کو حل کرنے کا ایک متمدن طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے ہم قومی زندگی میں کسی خلف شار سے بچتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں اور اس کے ساتھ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے رہیں۔ پھر اس بات میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ اجتماعی رائے کی نسبت فرد کی رائے میں غلطی کا امکان بہرحال زیادہ ہے۔

آج ضرورت ہے کہ ہماری قومی قیادت اس جانب متوجہ ہو کہ مسلمان معاشروں کو اگر ترقی کرنی ہے تو انھیں انسان کے تہذیبی ارتقا سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اپنی تمام توجہ ادارہ سازی پر دینا ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سیاست میں آمریت یا پاپائیت کے بجائے جمہوریت کا چلن ہو۔ سیاسی جماعتوں میں قیادتوں کے فیصلے خاندانی نسبت کے بجائے صلاحیت اور کارکنوں کے اعتماد کی بنیاد پر ہوں۔ پارلیمنٹ میں اکثریت کے فیصلے کو ہرصورت میں قبول کیا جائے قطع نظر اس کے یہ فیصلہ ہمارے گروہی مفادات سے کس حد تک متصادم ہے۔ اداروں کو مضبوط بنانے کی یہی صورت ہے اور ادارہ سازی کے بغیر اجتماعی بصیرت کو روبہ عمل لانے کا کوئی دوسرا طریقہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة النساء

(۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ، إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ، فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ، مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ، إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ، فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ، مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ، وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اُس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر اُن کے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر اولاد ہے تو ترکے کا ایک چوتھائی تمھارا ہے، جب کہ وصیت جو اُنھوں نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے ایک چوتھائی کی حق دار ہیں، اگر تمھارے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر اولاد ہے تو تمھارے ترکے کا آٹھواں حصہ اُن کا ہے، جب کہ وصیت جو تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔[۳۰]

[۳۰] یہ حصے ہر لحاظ سے واضح ہیں اور والدین کے حصوں کی طرح یہ بھی پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔

كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ، وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ، فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ، فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ، مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ

اور (اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں) اگر کسی مرد یا عورت کو اُس سے رشتہ داری کی بنا پر وارث بنا دیا جاتا ہے[۳۱] اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہے تو بھائی اور بہن، ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے (اور باقی اس کو ملے گا جسے وارث بنایا گیا ہے[۳۲]) جب کہ وصیت جو کی گئی ہو، پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے، بغیر کسی کو

---

[۳۱] اصل الفاظ ہیں: 'وان کان رجل یورث کلالة او امرأة'۔ ان میں لفظ 'کلالة' والدین اور اولاد کے سوا باقی سب رشتہ داروں کے لیے آیا ہے۔ اس معنی کے لیے اس کا استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اس شخص کے لیے بھی آتا ہے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، لیکن آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں۔ 'یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم' سے جو سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے، اس میں اولاد اور والدین کا حصہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وصیت پر عمل در آمد کی تاکید 'من بعد وصیة یوصی بها او دین' کے الفاظ میں کی ہے۔ زوجین کے حصوں میں اسی مقصد کے لیے 'من بعد وصیة یوصین بها او دین' اور 'من بعد وصیة توصون بها او دین' کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو ان سب مقامات پر فعل مبنی للفاعل استعمال ہوا ہے اور 'یوصی'، 'یوصین' اور 'توصون' میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے، لیکن کلالہ کے احکام میں یہی لفظ مبنی للمفعول ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ 'ان کان رجل یورث کلالة او امرأة' میں 'یوصی' کا فاعل یعنی مورث مذکور نہیں ہے، اس وجہ سے اس آیت میں 'کلالة' کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیر حجت قطعی ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ یہاں اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں کوئی نہ ہو، استعمال نہیں کیا ہے۔ چنانچہ آیت کی تالیف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ 'یورث' باب افعال سے مبنی للمفعول ہے۔ 'کلالة' اس سے مفعول لہ ہے۔ 'کان' ناقصہ ہے اور 'یورث' اس کی خبر واقع ہوا ہے۔ 'رجل او امراة' 'کان' کے لیے اسم ہیں۔ وارث بنانے کا جو اختیار اس آیت میں دیا گیا ہے، وہ ظاہر ہے کہ مرنے والے ہی کو ہوگا اور اس کے معنی اس سیاق میں یہی ہو سکتے ہیں کہ ان وارثوں کی عدم موجودگی میں ترکے کا وارث بنا دیا جاتا ہے جن کے حصے اوپر بیان ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

دَيۡنٍ، غَيۡرَ مُضَآرٍّ، وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۲﴾
تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ، وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ، يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ، خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا، وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ

نقصان پہنچائے۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا ہے، وہ بڑا نرم خو ہے[۳۳]۔ ۱۲

یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، (اِن سے آگے نہ بڑھو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کریں گے، اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی

---

[۳۲] یعنی ایک ہی رشتہ کے متعلقین میں سے اگر کسی ایک مرد یا عورت کو وارث بنایا جاتا ہے تو جس کو وارث بنایا جائے گا، اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو اس مال کا چھٹا حصہ جس کا اسے وارث بنایا گیا ہے، اس کے بھائی یا بہن کو دیا جائے گا اور اگر اس کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی ۵/۶ یا دو تہائی اس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جسے وارث بنایا گیا ہے۔ قرآن نے اسی بنا پر اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ـــــ ''زید نے اس رقم کا وارث اپنے بیٹے کو بنایا ہے، لیکن اس کا کوئی بھائی ہو تو ایک تہائی کا حق دار وہ ہوگا'' ـــــ تو اس جملے کا مطلب ہر شخص یہی سمجھے گا کہ بھائی کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ اس بیٹے کو دیا جائے گا جسے رقم کا وارث بنایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن، ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتے کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر، اپنے چچا زید کو ترکے کا وارث بنا دیتا ہے اور اس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے، اس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔

[۳۳] آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ یہ پروردگار عالم کی وصیت ہے۔ اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے باخبر ہے اور اگر

وَرَسُوْلَهٗ، وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ، يُدْخِلْهُ نَارًا، خَالِدًا فِيْهَا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔۱۳-۱۴

بے جانے بوجھے اس سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس کا خالق بردبار ہے، اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہ نرم خو ہے، بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس کی ہدایات میں ان کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

ہاتھ اور زبان کی حفاظت

(مسلم، رقم ۴۰، ۴۱، ۴۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عَبۡدُ اللّٰہِ بۡنِ عَمۡرِو بۡنِ الۡعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ یَقُوۡلُ اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ: أَیُّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ خَیۡرٌ؟ قَالَ: مَنۡ سَلِمَ الۡمُسۡلِمُوۡنَ مِنۡ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ.

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کون سا مسلمان بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔''

جَابِرٌ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ یَقُوۡلُ: سَمِعۡتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَقُوۡلُ: اَلۡمُسۡلِمُ مَنۡ سَلِمَ الۡمُسۡلِمُوۡنَ مِنۡ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ.

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔''

عَنۡ أَبِی مُوۡسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قُلۡتُ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ أَیُّ الۡاِسۡلَامِ

أَفۡضَلُ؟ قَالَ: مَنۡ سَلِمَ الۡمُسۡلِمُونَ مِنۡ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.

''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یارسول اللہ، کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔''

حَدَّثَنِي بُرَيۡدُ بۡنُ عَبۡدِ اللّٰهِ بِهٰذَا الۡإِسۡنَادِ. قَالَ سُئِلَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الۡمُسۡلِمِيۡنَ أَفۡضَلُ؟ فَذَكَرَ مِثۡلَهُ.

''حضرت برید بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اسی سند سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کون سا مسلمان بہتر ہے؟ اس کے بعد (حضور کا جواب) اوپر والی روایت کے مطابق بیان کیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لغوی مباحث

المسلم: بعض شارحین نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس میں لام کمال کے لیے ہے۔ اس کی وضاحت وہ عربوں کے ہاں مستعمل مثال سے کرتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: 'العالم زید' عالم تو زید ہے۔ 'المال الإبل' مال تو اونٹ ہوتے ہیں۔ اردو میں ہم جس بات کو ادا کرنے کے لیے ''اصل میں'' اور ''حقیقت کے اعتبار سے'' کی تعبیرات اختیار کرتے ہیں، عرب اس کے لیے لام تعریف لاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں جملے میں یہ معنی خبر کو مبتدا بنانے سے پیدا ہوئے ہیں۔ البتہ شارحین نے یہ معنی ٹھیک متعین کیے ہیں۔

أی الإسلام: لفظی مطلب 'کون سا اسلام'۔ عام طور پر استفہام کا 'أی' جمع یا ایسے واحد کی طرف مضاف ہوتا ہے جس کے افراد ایک سے زیادہ ہوں۔ یہاں معاملہ مختلف ہے۔ اس کو دو طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے ایک مضاف کو حذف مانا جائے۔ شارحین نے مثال کے طور پر یہاں 'خصال' کے لفظ کو محذوف قرار دیا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے لفظ سے اس کو اختیار کرنے والا مراد لیا جائے۔ اس دوسرے معنی کی تائید اسی روایت کے ایک متن سے ہوتی ہے جس میں یہی سوال 'أی المسلمین أفضل' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قوی ہے، اس لیے کہ جواب میں بھی عمل کرنے والا ہی پیش نظر ہے۔

معنی

قرآن مجید نے دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے مطلوب رویے کو کئی پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں خیرات کو احسان جتانے اور تکلیف دہ باتوں سے آلودہ کرنے سے روکا گیا ہے۔ جگہ جگہ احسان، ادائے امانت، اصلاح بین الناس، انفاق، ایثار، تواضع، حلم، شفقت، عدل، نصیحت اور عفوودرگزر جیسے مثبت رویوں کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح برے نام رکھنے، جھوٹے الزام لگانے، سوے ظن، گالی، مذاق اڑانے، غصہ، غیبت، قتل، برائی کے قصد سے سرگوشی، چوری اور خیانت جیسے گناہوں سے روکا گیا ہے۔ ہم اس سے پہلے ایک روایت میں پڑھ چکے ہیں کہ ایمان جب انسانی شخصیت کا جز بن جاتا ہے تو اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دیتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سچا مسلمان سراپا خیر خواہی بن جاتا ہے۔ وہ انسانوں کے خلاف کسی قسم کی تعدی خواہ وہ زبان سے ہو اور خواہ عمل سے ہو، کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ اوپر ہم نے قرآن مجید کی جن تعلیمات کا ذکر کیا ہے، ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک مسلمان سے کس طرح کے اخلاق مطلوب ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جملہ ان تعلیمات کے لیے سرعنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کا ذکر ہر طرح کے قول اور ہر نوع کے عمل کے لیے بطور علامت ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کی جان، مال اور آبرو، یہ تینوں چیزیں محترم ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'اس میں مسلمان وہ ہے' کی تعبیر اختیار کی ہے، اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کا یہ نتیجہ نکلنا چاہیے کہ آدمی کا قول وفعل دوسروں کے لیے ضرر رساں نہ رہے۔ استاذ محترم نے اس حدیث کا درس دیتے ہوئے اس قول کے ایک لازم کو بھی بیان کیا ہے۔ جب کوئی مسلمان یہ دیکھے کہ اس کے اندر یہ کردار پیدا نہیں ہوا تو اسے غور کرنا چاہیے کہ اس کے ایمان میں کیا کمی رہ گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متون

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت ایک جملے کی صورت ہی میں نقل کی ہے اور اس کے دو متن دیے ہیں۔ ایک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بطور خود بیان کی ہے اور دوسرے میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے یہ بات فرمائی ہے۔ اس روایت کے دوسرے متون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی مواقع پر فرمائی تھی۔ ہم ان میں سے چند متون یہاں نقل کرتے ہیں۔

ابن حبان کی روایت کے مطابق یہ جملہ حجۃ الوداع کے خطبے کا حصہ ہے:

حدثني فضالة بن عبيد قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع: ألا أخبركم بالمؤمن من أمنه الناس على أموالهم وأنفسهم. والمسلم من سلم الناس من لسانه ويده، والمجاهد من جاهد نفسه في طاعة اللّٰه والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب. (رقم ۴۸۶۲)

''حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: میں تمھیں مومن کے بارے میں نہ بتاؤں؟ (مومن وہ ہے) جس سے لوگ اپنے مال اور جان کے حوالے سے محفوظ ہوں۔ اور مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے غلطیاں اور گناہ چھوڑ دیے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بعض روایات میں ایک طویل مکالمہ نقل ہوا ہے جس میں ایک سوال اور جواب یہ بھی تھا۔ اسی طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے کچھ نصیحت کے جملے کہے تھے کہ ایک آدمی نے یہ سوال کیا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے یہ بات کئی مواقع پر بیان کی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلمانوں میں کردار کا یہ پہلو کس قدر اہم تھا۔ ہم مسلمانوں کی عمومی زندگی کا مطالعہ کریں تو سب سے زیادہ مسلمانوں میں کردار کے اسی پہلو کی کمی نظر آتی ہے۔

بہرحال مسلم میں روایت کا جس قدر حصہ نقل ہوا ہے، اس کے دونوں جملے متعدد صورتوں میں روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔ مثلاً سوال ہی کو لے لیجیے وہ تین چار صورتوں میں منقول ہے: 'أي المسلمين خير'، 'أي الإسلام أفضل'، 'أي المسلمين أفضلهم اسلاما'، 'أي المسلمين أفضل'۔ اسی طرح جواب والا جملہ دو تین طریقوں سے نقل ہوا ہے: 'أسلم المسلمين اسلاما من ...'، 'المسلم من سلم الناس ...'، 'أكمل المؤمنين من...'، 'أن يسلم المسلمون من لسانك ويدك'۔ روایت کے آغاز میں بھی اسی طرح کے لفظی فرق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی ممکن صورتیں ہیں، سب اختیار کر لی گئی ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۱۰، ۱۱، ۶۱۱۹۔ مسلم، رقم ۴۰، ۴۱، ۴۲۔ ابوداؤد، رقم ۲۴۸۱۔ نسائی، رقم ۴۹۹۵، ۴۹۹۶، ۴۹۹۹۔ ترمذی،

رقم ۲۵۰۴، ۲۶۲۷ـ احمد، رقم ۶۵۱۵، ۶۷۵۳، ۶۷۹۲، ۶۸۰۶، ۶۸۳۵، ۶۸۸۹، ۶۹۱۲، ۶۹۲۵، ۶۹۵۳، ۶۹۵۵، ۶۹۸۲، ۶۹۸۳، ۷۰۱۷، ۷۰۸۶، ۸۴۱۸، ۱۵۶۷۳، ۱۵۶۸۲، ۲۴۰۰۴، ۲۴۰۱۳ـ ابن حبان، رقم ۱۸۰، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۳۰، ۳۹۹، ۴۰۰، ۵۱۰، ۴۸۶۲ـ حاکم، رقم ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۶۲۰۰، ۶۶۲۸ـ دارمی، رقم ۲۷۱۲، ۲۷۱۶ـ بیہقی، رقم ۲۰۵۴۵ـ ابویعلیٰ، رقم ۷۲۸۶ـ سنن کبریٰ، رقم ۸۷۰۱، ۱۱۷۲۶، ۱۱۷۲۷، ۱۱۷۳۰ـ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۶۴۹۶ـ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شرح موطا

ساجد حمید

گوہ کی حرمت اور خیرات کے آداب

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عن[1] عائشة رضی الله عنها قال: أتی رسول الله صلی الله علیه و سلم بضب فلم یاکله[2] ولم ینه[3] عنه قلت یا رسول الله[4] افلا نطعمه المساکین قال لا تطعموهم مما لا تاکلون[5].

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گوہ پیش کی گئی، تو آپ نے بالکل نہیں کھائی، اور نہ آپ نے دوسروں کو روکا۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ (ہم اسے ضائع کرنے کے بجائے) کیا غریب لوگوں کو نہ کھلا دیں؟ آپ نے فرمایا، انھیں وہ چیز نہ کھلاؤ جو تم خود نہیں کھاتے[1]۔"

ترجمے کے حواشی

۱۔ روایت کے پہلے حصے میں وہی مضمون بیان ہوا ہے، جو ہم گوہ سے متعلق دوسری روایتوں میں دیکھ چکے ہیں کہ جب سیدہ میمونہ کے گھر میں گوہ تحفے میں آئی تو آپ نے نہیں کھائی، البتہ کھانے والوں کو آپ نے نہیں روکا۔

دوسرے حصے سے صدقہ وخیرات کا ادب معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہی ادب ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: 'لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون' (۳:۹۲) تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے، جب تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، جن کو تم پسند کرتے ہو۔ یہی اصول ہے جس کو نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات کے ایک عمومی اصول کے طور پر بھی بیان کیا ہے کہ ''دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔'' یعنی چونکہ تم گوہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اس لیے اسے خیرات بھی نہ کرو۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت مسند احمد، رقم ۲۴۷۸۰ سے ہے۔ کچھ اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر آئی ہے: مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۴۶۱؛ مسند احمد، رقم ۲۵۱۵۳؛ سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۱۰، ۱۹۲۱۱۔

۲۔ 'أتي رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم بضب فلم یأکله' کے بجائے مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۴۶۱؛ سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۱۰، ۱۹۲۱۱ میں 'اهدی لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم ضب فلم یأکل منه' کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۔ اس مضمون کی اکثر روایتوں میں 'لم ینه' کے الفاظ نہیں آئے۔ صرف 'لم یاکل' کے الفاظ ہیں۔ جن میں 'لم ینه' کے الفاظ نہیں آئے وہ روایتیں درج ذیل ہیں: مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۴۶۱؛ مسند احمد، رقم ۲۵۱۵۳؛ سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۱۰، ۱۹۲۱۱۔

۴۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۴۶۱ میں سیدہ عائشہ کا سوال اور آپ کا جواب یوں نقل ہوا ہے: 'یا رسول اللّٰه الا اطعمه السؤال قال لا اطعم السؤال الا ما أکل منه' (اے رسول اللہ، کیا میں مانگنے والوں کو یہ کھانا نہ کھلا دوں۔ آپ نے فرمایا: میں مانگنے والوں کو بس وہی چیز کھلاؤں گا، جو میں کھانا پسند کرتا ہوں)۔ سنن البیہقی، رقم ۱۹۲۱۱ میں آپ کا جواب جمع متکلم کے صیغوں میں نقل ہوا ہے: 'فقلت یا رسول اللّٰه الا تطعمه السؤال فقال انا لا نطعمهم مما لا نأکل' (سیدہ عائشہ کہتی ہیں: میں نے آپ سے کہا: اے رسول اللہ، کیا میں سائل کو یہ نہ کھلا دوں۔ آپ نے فرمایا: ہم جو خود نہیں کھاتے دوسروں کو بھی نہیں کھلاتے)۔

۵۔ روایت کے اس آخری حصے کی نسبت کے بارے میں محدثین کا اطمینان نہیں ہے۔ مثلاً شیخ ارناؤط لکھتے ہیں: 'حدیث صحیح دون قوله: لا تطعموهم مما لا تاکلون'، یہ حدیث 'لا تطعموهم مما لا تاکلون' والے جملے کے سوا صحیح ہے۔ سیدہ عائشہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین غریبوں کو گوہ کھلانے سے متعلق سوال و جواب پر مبنی یہ مکالمہ روایت کرنے میں اس روایت کے ایک راوی حماد بن ابی سلیمان منفرد ہیں۔ سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۱۰ میں بیہقی نے آخری جملے کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ حماد بن ابی سلیمان اس سوال جواب کے مکالمہ کو نقل کرنے میں منفرد ہیں۔

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۱۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

۳۔ تکلیف مالا یطاق

انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے جو شریعت انسانوں کو دی گئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کوئی ایسا حکم کبھی نہیں دیتے جو انسان کے تحمل سے باہر ہو۔ اس کے تمام اعمال میں یہ معیار ہمیشہ سے قائم ہے کہ لوگوں کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ ان پر نہ ڈالا جائے اور جو حکم بھی دیا جائے، انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیا جائے۔ چنانچہ بھول چوک، غلط فہمی اور بلا ارادہ کوتاہی پر اس شریعت میں کوئی مواخذہ نہیں ہے اور لوگوں سے اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں وہ پوری صداقت اور ایمان داری کے ساتھ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ 'لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا'[۴۶] (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) اور اس مضمون کی دوسری آیات اسی سنت کو بیان کرتی ہیں۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بندے اگر سرکشی اختیار کر لیں تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ ایسی کوئی تکلیف انھیں نہیں دیتے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تادیب و تربیت کے لیے[۴۷]، تعذیب کے لیے[۴۸] یا لوگوں کے

---

[۴۶] البقرہ ۲: ۲۸۶۔

[۴۷] بقرہ کی اسی آیت میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، آگے یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ پروردگار، تو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا۔

[۴۸] یہ قرآن کا عام مضمون ہے اور جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔

برے اعمال کا نتیجہ ان کو دکھانے[٤٩] یا خدا کے مقابلے میں ان کا عجز ان پر ظاہر کر دینے کے لیے[٥٠] اس طرح کی تکلیف یقیناً دی جاتی ہے۔

۴۔عزل ونصب

ابتلا کا جو قانون اس سے پہلے بیان ہوا ہے، اس کے تحت اللہ تعالیٰ جس طرح افراد کو صبر یا شکر کے امتحان کے لیے منتخب کرتا ہے، اسی طرح قوموں کو بھی منتخب کرتا ہے۔ اس انتخاب کے نتیجے میں جب کوئی قوم ایک مرتبہ سرفرازی حاصل کر لیتی ہے تو اللہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ علم و اخلاق کے لحاظ سے اپنے آپ کو پستی میں نہیں گرا دیتی۔ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے اور اپنی اس سنت کے مطابق جب کسی قوم کے لیے بار بار کی تنبیہات کے بعد وہ ذلت و نکبت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور دنیا کی کوئی قوت بھی خدا کے مقابلے میں اس قوم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان کی پوری تاریخ قوموں کے عزل ونصب میں اس سنت کے ظہور کی گواہی دیتی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ، وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا، فَلاَ مَرَدَّ لَهٗ، وَمَا لَهُم مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (الرعد ۱۳: ۱۱)

”اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے اوصاف میں تبدیلی نہ کر لے اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور اللہ کے مقابلے میں اس طرح کے لوگوں کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوتا۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۵۔نصرت الٰہی

اللہ جب اپنا کوئی مشن کسی فرد یا جماعت کے سپرد کرتا اور اس کو اسے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس کی مدد بھی فرماتا ہے۔ یہ مشن دعوت کا بھی ہو سکتا ہے اور جہاد و قتال کا بھی۔ 'کان حقا علینا نصر المومنین'[٥١] (ایمان والوں کی نصرت ہم پر لازم تھی) اور اس مضمون کی دوسری آیتوں میں یہ بات کئی جگہ بیان ہوئی ہے کہ اس طرح کے کسی مشن کو پورا کرنے میں ایمان والوں کی مدد اللہ نے اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے:

٤٩؎ القلم ۶۸: ۴۲۔ النساء ۴: ۱۰۰۔

٥٠؎ البقرہ ۲: ۲۴۔

٥١؎ الروم ۳۰: ۴۷۔

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُوا، إِن تَنصُرُوا اللّٰهَ يَنصُرْكُمْ، وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ. (محمد ۴۷: ۷)

’’ایمان والو، تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم مضبوط جما دے گا۔‘‘

یہ مدد الل ٹپ نہیں ہوتی۔ اس کا ایک ضابطہ ہے اور یہ اسی کے مطابق ظہور میں آتی ہے۔ اس کی تفصیلات ہم آگے اسی کتاب میں ’’قانون جہاد‘‘ کے زیر عنوان بیان کریں گے۔ اتنی بات، البتہ یہاں واضح رہنی چاہیے کہ اس کے لیے سب سے ضروری چیز صبر اور تقویٰ ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ احد کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے انھیں امید دلائی کہ اللہ تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید کی اور اپنی عنایت سے اس پر دو ہزار فرشتوں کا اضافہ بھی کر دیا، لیکن اس کے ساتھ صراحت کر دی کہ یہ وعدہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ مسلمان ثابت قدم رہیں اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے بچیں۔

بَلٰـى، إِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا، وَيَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَـوْرِهِـمْ هٰذَا، يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ. (آل عمران ۳: ۱۲۵)

’’ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور تمھارے دشمن اسی وقت تم پر آ پڑیں تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۶۔ توبہ واستغفار

انسان اگر کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے لیے توبہ و استغفار کی گنجایش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے، اس لیے گناہ کے بعد توبہ و اصلاح کر لینے والوں کو وہ کبھی سزا نہیں دیتا۔[۵۲] اس معاملے میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ اگر گناہ کے فوراً بعد توبہ کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں لازماً معاف کر دیتا ہے، لیکن ان لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں کرتا جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے اور جب دیکھتے ہیں کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے تو توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دینے والوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی، اگر وہ موت کے وقت تک اس انکار پر قائم رہے ہوں۔ توبہ و استغفار سے متعلق یہ سنت الٰہی قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

إِنَّـمَـا التَّـوْبَةُ عَـلَـى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ، ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ، فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، وَكَانَ اللّٰهُ

’’اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن

۵۲؎ الانعام ۶: ۵۴۔

عَلِيُماً حَكِيُماً. وَلَيُسَتِ التَّوُبَةُ لِلَّذِيُنَ يَعُمَلُوُنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الُمَوُتُ، قَالَ: إِنِّيُ تُبُتُ الٰئنَ، وَلَا الَّذِيُنَ يَمُوُتُوُنَ، وَهُمُ كُفَّارٌ، أُولٰٓئِكَ أَعُتَدُنَا لَهُمُ عَذَاباً أَلِيُماً. (النساء۴: ۱۷-۱۸)

کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ اُن لوگوں کے لیے البتہ، کوئی توبہ نہیں ہے جو گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ اسی طرح اُن کے لیے بھی توبہ نہیں ہے جو مرتے دم تک منکر ہی رہیں۔ یہی تو ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔''

۷۔ جزا و سزا

موت کے بعد جزا و سزا تو ایک اٹل حقیقت ہے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ اس دنیا میں بھی دی جاتی ہے۔ خدا کی عدالت کا جو ظہور قیامت کے دن اس کے منتہاے کمال پر ہونے والا ہے، یہ اسی کی تمہید ہے۔ اس کی جو صورتیں اللہ تعالیٰ نے بالکل متعین طریقے پر بیان فرمائی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں، اسی کے لیے جیتے، اسی کے لیے مرتے اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا حساب اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہتے ہیں، دے کر اسی دنیا میں بے باق کر دیتے ہیں اور ان کی تمام کارگزاریوں کا پھل انھیں یہیں مل جاتا ہے:

مَنُ كَانَ يُرِيُدُ الُحَيٰوةَ الدُّنُيَا، وَزِيُنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيُهِمُ أَعُمَالَهُمُ فِيُهَا، وَهُمُ فِيُهَا لَا يُبُخَسُوُنَ. (ہود۱۱: ۱۵)

''جو دنیا کی زندگی اور اس کے سروسامان ہی کے طالب ہوتے ہیں، اُن کے اعمال کا بدلہ ہم یہیں چکا دیتے ہیں اور اس میں ان کے لیے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔''

ثانیاً، رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد ان کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے اور ماننے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوُلٌ، فَإِذَا جَآءَ رَسُوُلُهُمُ قُضِيَ بَيُنَهُمُ بِالُقِسُطِ، وَهُمُ لَا يُظُلَمُوُنَ. (یونس۱۰: ۴۷)

''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی قوم کے پاس اُس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اُس کے لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

یہ خدا کی غیر مبتدل سنت ہے۔قوم نوح،قوم لوط،قوم شعیب، عاد وثمود اور اس طرح کی دوسری قوموں کے جو واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ اسی دینونت کی سرگزشت ہیں۔انسانی تاریخ میں یہ دینونت آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لیے برپا ہوئی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہے:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِيۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّبِيٍّ إِلَّآ أَخَذۡنَا أَهۡلَهَا بِالۡبَأۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ، لَعَلَّهُمۡ يَضَّرَّعُوۡنَ. ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوۡا، وَّقَالُوۡا: قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَ نَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ، فَأَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً، وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ. وَلَوۡ أَنَّ أَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡأَرۡضِ ، وَلٰـكِنۡ كَذَّبُوۡا ، فَأَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ. (الاعراف ۷: ۹۴-۹۶)

''اور ہم نے جس بستی میں بھی کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اس کے رہنے والوں کو جان و مال کی مصیبتوں سے ضرور آزمایا ہے تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا، یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادوں پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں۔ آخر کار ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں کچھ خبر بھی نہیں تھی۔ اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے جھٹلا دیا تو ان کے کرتوتوں کی پاداش میں ہم نے انھیں پکڑ لیا۔''

ثالثاً، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہو تو اسے قوموں کی امامت حاصل ہوگی اور اس سے انحراف کرے تو اس منصب سے معزول کر کے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دی جائے گی۔ 'اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِيۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ'[۵۳] (تم میرا وعدہ پورا کرو، میں تمھارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کروں گا) کے الفاظ میں قرآن نے بنی اسرائیل کے ساتھ جس عہد کا حوالہ دیا ہے، وہ یہی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں 'اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا'[۵۴] (تم وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے) کی تہدید میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بائیبل کے صحائف تمام تر اسی کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

وَإِذِ ابۡتَلٰٓى إِبۡرٰهِيۡمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ، قَالَ: إِنِّيۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا، قَالَ: وَمِنۡ

''اور یاد کرو، جب ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو اُس نے وہ پوری کر دیں، فرمایا:

۵۳؎ البقرہ ۲: ۴۰۔

۵۴؎ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۔

ذُرِّيَّتِيْ؟ قَالَ: لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ.

(البقرہ ۲:۱۲۴)

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں لوگوں کا امام بناؤں گا۔ عرض کیا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا یہ عہد اُن میں سے ظالموں کو شامل نہیں ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے جس کی بنا پر خاص بنی اسرائیل کے لیے فرمایا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ، وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ، لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ، وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ، مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ.

(المائدہ ۵:۶۶)

’’اور اگر وہ تورات وانجیل کو اور اُس چیز کو قائم کرتے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر نازل کی گئی ہے تو اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے (اُس کا) رزق پاتے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ) ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے، لیکن زیادہ ایسے ہیں جن کے عمل بہت برے ہیں۔‘‘

استثنا میں ہے:

’’اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جان فشانی سے مان کر اس کے سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہو گا اور کھیت میں بھی مبارک ہو گا... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں، تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ وہ تیرے مقابلے کو تو ایک ہی راستے سے آئیں گے، پر سات سات راستوں سے ہو کر تیرے آگے سے بھاگیں گے...اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے، تجھ سے ڈر جائیں گی...اور خداوند تجھ کو دم نہیں، بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں، بلکہ سرفراز ہی رہے گا...لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہو گا اور کھیت میں بھی لعنتی ہو گا...خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تو ان کے مقابلے کے لیے تو ایک ہی راستے سے جائے گا اور ان کے سامنے سے سات سات راستوں سے ہو کر بھاگے گا اور دنیا کی تمام سلطنتوں میں تو مارا مارا پھرے گا۔‘‘ (۲۸:۱-۲۵)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عمار خان ناصر

سی پی ایس انٹرنیشنل ـــــــ کسی نئے فتنے کی تمہید؟

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مولانا وحید الدین خان کا شمار بلاشبہ اس وقت عالم اسلام کی چند بڑی شخصیات میں ہوتا ہے۔ مولانا محترم نے دین کے صحیح تصور، اس کے اجزا اور عناصر کے باہمی تعلق، دین کی حقیقی روح اور اس کے مطالبات کے صحیح رخ کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ امت میں پیدا ہونے والے فکری و عملی رویوں اور بالخصوص معاصر دنیا میں مسلمانوں کے فکری اور ذہنی مزاج کے تجزیے کی خدمت جس خوبی، گہرائی اور بصیرت کے ساتھ انجام دی ہے اس میں کسی کو ان کا ثانی قرار دینا مشکل ہے۔ ان کی فکری اور دعوتی جدوجہد لگ بھگ نصف صدی کے عرصے کو محیط ہے اور اپنے موقف اور استدلال پر استقامت اور اس کے فروغ کے لیے ان تھک محنت کے نتیجے میں پوری دنیا میں ان کا ایک وسیع حلقۂ فکر وجود میں آ چکا ہے۔ نہ صرف مسلم امہ میں ان کی شخصیت دعوت اسلام کا عنوان سمجھی جاتی ہے، بلکہ غیر مسلم حلقوں تک بھی ان کے ذریعے سے اسلام کا پیغام وسیع پیمانے پر پہنچا ہے۔

تاہم تمام اہل فکر کی طرح مولانا محترم کی شخصیت اور طرز فکر کے بہت سے پہلو بھی ارباب فکر ونظر کے ہاں موضوع بحث رہے ہیں، جن میں سے ایک پہلو کی طرف ہم ان سطور میں توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ مولانا کے زاویۂ نگاہ سے اصولی طور پر اتفاق رکھنے والے اہل فکر کا ایک حلقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مخالف فکری زاویوں اور شخصیات پر تنقید کے

لیے ان کا اختیار کردہ لب ولہجہ اور اسلوب 'رایی صواب یحتمل الخطا و رایھم خطا یحتمل الصواب' کے ذہنی رویے کے بجائے حتمیت کی عکاسی کرتا ہے اور وہ اپنے زاویۂ نگاہ کو 'ایک نقطۂ نظر' سمجھنے کے بجائے 'واحد درست طرز فکر' قرار دینے پر اصرار میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہ طرز فکر ایک عمومی فکری دائرے کے اندر رہے تو انسانی نفسیات میں کسی حد تک اس کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس ذہنی رویے نے اب ایک ایسا رخ اختیار کر لیا ہے جس سے ہماری رائے میں نہ صرف مولانا کی پوری جدوجہد کی افادیت پر ایک سوالیہ نشان کھڑا ہو گیا ہے، بلکہ اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ خود دین کے حوالے سے ایک خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے۔

ایک عرصے کی عمومی دعوت اور ذہن سازی کے بعد مولانا نے چند سال قبل اپنے فہم کے مطابق دعوت اسلام کو عالمی سطح پر پھیلانے کے لیے ''سی پی ایس انٹرنیشنل'' کے نام سے ایک فورم تشکیل دیا ہے جس میں شامل افراد کی ایک مخصوص ٹیم براہ راست مولانا محترم سے ذہنی وفکری اور روحانی تربیت حاصل کرتی ہے۔ ایک تازہ تحریر میں مولانا محترم نے دعوت اسلام میں اس ٹیم کا کردار اور اس کے ''فضائل ومناقب'' یوں بیان فرمائے ہیں:

''ماضی اور حال کے تمام قرائن تقریباً یقینی طور پر یہ بتاتے ہیں کہ سی پی ایس کی ٹیم ہی وہ ٹیم ہے جس کی پیشین گوئی کرتے ہوئے پیغمبر اسلام نے اس کو اخوان رسول کا لقب دیا تھا۔ اصحاب رسول کوئی عجیب الخلقت لوگ نہ تھے بلکہ وہ عام انسانوں کی طرح انسان تھے۔ اسی طرح اخوان رسول بھی کوئی عجیب الخلقت لوگ نہ ہوں گے بلکہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح انسان ہوں گے۔ ان کی پہچان یہ نہ ہوگی کہ وہ انوکھے جسم والے ہوں گے یا یہ کہ وہ کرامتیں دکھائیں گے۔ ان کی پہچان صرف یہ ہوگی کہ وہ دعوت حق کے اس ربانی مقصد کے لیے کھڑے ہوں گے جس پر رسول اور اصحاب رسول کھڑے ہوئے تھے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی تحریکیں اٹھی ہیں مگر وہ اخوان رسول کا درجہ نہیں پا سکتیں۔ اس لیے کہ اخوان رسول کا درجہ صرف وہ لوگ پا سکتے ہیں جو 'ما انا علیہ و اصحابی' کا مصداق ہوں۔ موجودہ زمانے میں اٹھنے والی تمام تحریکیں ردعمل کی تحریکیں تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی تحریک ایسی نہیں جس کا یہ کیس ہو کہ اس کے رہنما نے ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہو کر قرآن اور سنت کا مطالعہ کیا اور پھر خالص مثبت بنیادوں پر اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ خصوصیت صرف سی پی ایس انٹرنیشنل کی تحریک میں پائی جاتی ہے۔

تاریخ میں اہل حق کے لیے جو بڑے بڑے امکانات رکھے گئے تھے، اب وہ سب امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ پیغمبروں کا ساتھ دینا، مسیح کا حواری بننا، پیغمبر آخر الزماں کے اصحاب میں شامل ہونا۔ اب صرف ایک بڑا درجہ باقی رہ گیا ہے، یہ درجہ اخوان رسول کے گروپ کا حصہ بننا ہے۔ اس کے بعد جو چیز ہے، وہ تاریخ کا خاتمہ (end of

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(history) ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تاریخ کا آخری مبارک موقع ہے۔جس نے اس موقع کو پالیا،اس نے سب کچھ پالیااور جس نے اس موقع کو کھو دیا،اس نے سب کچھ کھو دیا۔'' (ماہنامہ تذکیر، ستمبر۲۰۰۶، ۴۲)

ہم مولانا محترم کے تمام تر شخصی احترام اوران کی کاوشوں کی قدر و قیمت کے پورے اعتراف کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مذکورہ دعویٰ ایک بے حد سطحی، خطرناک اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔مولانا محترم نے اس پیشین گوئی کے لیے جس روایت کو ماخذ بنایا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک موقع پر قبرستان تشریف لے گئے اور فرمایا: 'وددت انا قد راینا اخواننا' (میری خواہش ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتے) صحابہ نے کہا، یارسول اللہ، کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: 'انتم اصحابی واخواننا الذین لم یاتوا بعد' (تم تو میرے اصحاب ہو، ہمارے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے)۔'' (مسلم، رقم ۳۶۷)

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں کسی مخصوص گروہ کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں فرمائی۔ آپ نے اپنے دور کے اہل ایمان کو اپنے اصحاب، جب کہ اپنے بعد آنے والے اہل ایمان کو اپنے بھائی کہا ہے۔ یہاں کسی مخصوص گروہ کا ذکر اور اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا مقصود ہی نہیں۔اس سادہ بیان کو کسی مخصوص گروہ کے بارے میں پیشین گوئی قرار دے کر اس گروہ کی علامات اور خصوصیات کا تعین اور پھر پورے یقین اور دعوے کے ساتھ سی پی ایس انٹرنیشنل کو اس کا مصداق قرار دینا محض مولانا محترم کی ذہنی اختراع ہے۔اپنے لائحۂ عمل کی صحت اور اپنی تیار کردہ ٹیم کی صلاحیتوں کے بارے میں مولانا محترم کا ایمان و یقین کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، اس کا مذکورہ تحریر میں نظر آنے والے ادعا کی حد تک پہنچ جانا، ایک بے حد خطرناک بات ہے۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقدس اور خدائی انتخاب کے زعم کے ساتھ اٹھنے والی اس طرح کی تحریکیں بالعموم کسی نہ کسی مذہبی فتنے پر ہی منتج ہوتی ہیں۔اول تو عام فکری، سماجی یا سیاسی تحریکوں میں بھی دعوت فکر دینے والی شخصیت، آہستہ آہستہ اصل فکر کی جگہ لے لیتی ہے اور بجائے خود تعلق اور وابستگی کا معیار بن جاتی ہے۔اس کے ساتھ اگر کام دینی و مذہبی نوعیت کا ہو تو اپنی حکمت عملی اور جماعت کے بارے میں 'تقدس' اور 'الٰہی انتخاب' کے غرے میں مبتلا ہو جانا بھی ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ ان دونوں چیزوں کو وجود میں لانے کے لیے کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر مولانا وحیدالدین خان کی سطح کے رہنما بھی خود انگلی پکڑ کر پیرو کاروں کو اس راستے پر چلنے کی دعوت دینے لگیں تو:

اب کسے رہنما کرے کوئی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لا یقلدن احدکم دینه رجلا، فان آمن آمن، وان کفر کفر، وان کنتم لا بد مـقتدین فاقتدوا بالمیت، فان الحی لا یؤمن علیه الفتنة.
(المعجم الکبیر للطبرانی، رقم ۸۷۶۴)

''تم میں سے کوئی شخص دین کے معاملے میں اپنی باگ کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں نہ دے دے کہ اگر وہ ایمان لائے تو یہ بھی ایمان لے آئے اور اگر وہ کفر کرے تو یہ بھی کفر پر راضی ہو جائے۔ اور اگر تمھیں ضرور کسی کی اقتدا ہی کرنی ہے تو اس کی کرو جو دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، کیونکہ کوئی زندہ شخص اس بات سے مامون نہیں کہ وہ کسی بھی وقت فتنے میں مبتلا ہو جائے۔''

اگر خدانخواستہ، خدانخواستہ سی پی ایس انٹرنیشنل کسی نئے مذہبی فتنے کا پیش خیمہ ہے اور امت مسلمہ اور بالخصوص پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مولانا کے معتقدین کا دین و ایمان کسی نئے امتحان سے دوچار ہونے والا ہے تو ہم اس سے پناہ مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور مولانا اور ان کے معتقدین کے ایمان کی حفاظت کی دعا کرتے ہیں: اللّٰھم انا نستودعك دیننا و امانتنا و خواتیم اعمالنا۔ آمین

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پروفیسر خورشید عالم

چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن''

—— ۶ ——

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ائمۂ اربعہ اور چہرے کا پردہ

ابن رشد کا ''بدایۃ المجتہد'' (۱: ۸۳) میں قول ہے کہ ''اکثر علما کا مسلک ہے کہ عورت کا سارا بدن بجز چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر ہے۔'' امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ ''دونوں پاؤں بھی ستر میں شامل نہیں۔''

ابن ہبیرہ حنبلی اپنی کتاب ''الافصاح'' (بحوالہ جلباب المراۃ ۷) میں فرماتے ہیں کہ ''تین ائمہ کا مسلک ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں اور امام احمد بن حنبل کا ایک قول بھی یہی ہے۔'' المجموع (۳: ۱۶۹) میں ہے کہ ''جن علما کا یہ مسلک ہے ان میں ابوحنیفہ، مالک اور شافعی شامل ہیں اور امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے۔'' امام طحاوی نے ''شرح المعانی'' (۲: ۲) میں امام ابوحنیفہ کے دو ساتھیوں (ابویوسف اور محمد) سے یہی مسلک نقل کیا ہے اور شافعیوں کی اہم کتابوں مثلاً شیخ شربینی کی ''الاقناع'' (۲: ۱۱۰) میں یہی مسلک قطعی طور پر درست قرار دیا گیا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر ''التمہید'' (۶: ۳۶۴) میں بڑی وضاحت سے لکھتے ہیں کہ عورت نماز اور احرام میں اپنا چہرہ کھلا رکھے گی۔ یہ امام مالک، ابوحنیفہ اور شافعی اور ان کے اصحاب کا قول ہے اور یہی قول امام اوزاعی اور ابوثور کا ہے کہ عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھے۔ ابن قدامہ حنبلی ''المغنی'' (۱: ۶۳۹) میں لکھتے ہیں کہ مالک، اوزاعی اور شافعی کا قول ہے کہ آزاد عورت کا سارا بدن سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے قابل پوشیدگی

ہے، کیونکہ 'الا ما ظہر منھا' میں ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ اور کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں نقاب اور دستانے پہننے کو منع فرمایا ہے اگر چہرہ اور ہتھیلیاں 'عورۃ' ہوتیں تو ان کے چھپانے کو حرام نہ قرار دیا جاتا اور چونکہ خرید و فروخت کے لیے چہرہ اور لینے دینے کے لیے ہتھیلیوں کو کھلا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔[1] ''المغنی'' (۷:۴۶۲) میں ہے کہ امام احمد نے حضرت اسماء کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جاتی ہے تو مناسب نہیں کہ چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ کوئی اور چیز نظر آئے۔ حیض کی تخصیص اسی بات کی دلیل ہے کہ جو حیض کی عمر کو نہ پہنچی ہو اس کے لیے ان دو اعضا سے زیادہ کو کھلا رکھنا جائز ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ امام احمد کا چہرے اور ہتھیلیوں کو کھلا رکھنے کا قول زیادہ درست ہے۔

علامہ ابن مفلح حنبلی اپنی کتاب ''الآداب الشرعیہ'' میں اس سوال کا جواب کہ آیا عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنا چہرہ چھپائے یا مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لے، یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لے۔

امام ابن تیمیہ ''مجموع فتاویٰ'' (۱۰:۱۷۳) میں 'الا ما ظہر منھا' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ابن عباس کا قول ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں زینت ظاہرہ میں شامل ہیں اور امام احمد کا دوسرا قول بھی یہی ہے اور علما کی ایک جماعت مثلاً امام شافعی وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔

''منیۃ المصلی'' کی شرح ''الـمـجلی لما فی منیۃ المصلی'' (صفحہ ۱۷۵) میں مولانا وصی احمد کہتے ہیں: ''سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے۔'' یہی قول امام مالک، شافعی کا ہے اور امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے (ذہن میں رہے کہ یہ شارح حنفی ہیں اور امام ابوحنیفہ چہرے اور ہتھیلیوں کے ساتھ پاؤں کو بھی شامل کرتے ہیں) اور مفسرین کا بھی یہی قول ہے کہ ''اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔''

میں انھی حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی چہرے اور ہتھیلیوں کو ستر میں شامل نہیں کرتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جو اعضا عادتاً کھلے رہیں گے وہی عادتاً بھی کھلے رہیں گے، کیونکہ اس کے چھپانے میں عورت کو تنگی اور تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اللہ کے رسول نے احرام والی عورت کو چہرہ چھپانے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے اگر چہرے کا چھپانا واجب ہوتا تو آپ اس کے چھپانے کو حرام قرار نہ دیتے۔ امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے اور حنبلی فقہا نے اسی پر عمل کیا ہے۔

---

[1] چہرہ کھلا رکھنے کے لیے یہ تین دلائل ہر مکتب فکر کی فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ ہے ائمۂ اربعہ کا مسلک۔ ان میں سے کسی امام نے چہرے کے پردے کو فتنہ کی شرط سے مشروط نہیں کیا اور متقدمین علما نے بھی اس شرط کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ متاخرین فقہا نے اپنے ائمہ کی تقلید میں یہ تو تسلیم کیا ہے کہ چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا واجب نہیں، مگر مقلد ہونے کے باوصف انھوں نے اسے فتنہ سے مشروط کر دیا ہے اور فتنہ کا مفہوم یہ نکالا ہے کہ ''عورتیں مردوں کے لیے باعث فتنہ ہیں۔'' مرد تو گویا آسمان سے نازل شدہ پاکیزہ مخلوق ہیں۔ صاحب مضمون نے ان متاخرین کے اقوال کو غلط طور پر ائمہ سے منسوب کر کے بے بنیاد دعویٰ جڑ دیا ہے کہ متقدمین احناف کے نزدیک حالت فتنہ میں چہرے کا پردہ واجب ہے۔ میں نے کتابوں کا حوالہ دے کر ثابت کیا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔

شہوت کی نظر اور فتنے کا ڈر

سب سے پہلے یہ بات طے ہونی چاہیے کہ فتنہ ہے کیا؟ اس کا ماخذ مرد ہے یا عورت؟ قرآن حکیم نے اس فتنے کو روکنے کے لیے کیا حکم صادر فرمایا ہے؟

اس بات پر اجماع ہے کہ اجنبی مرد شہوت اور لذت کے بغیر عورت کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ فقہ کی امہات الکتب میں نگاہ کے جواز کی بحث کے ضمن میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ اصل فتنہ یہ ہے کہ عورت کو شہوت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو روکنے کے لیے مردوں اور عورتوں کو نگاہیں نیچی کرنے کا حکم دیا ہے نہ کہ عورتوں کو مردوں کے سامنے چہرہ چھپانے کا۔ چنانچہ سد ذریعہ نگاہیں نیچی کرنا ہے نہ کہ چہرہ چھپانا۔ پھر غض بصر کا حکم جیسے مردوں کو دیا گیا ہے بالکل اسی طرح، بلکہ ان سے پہلے عورتوں کو دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ جس طرح عورتوں کا چہرہ مردوں کے لیے فتنہ کا سبب ہے بالکل اسی طرح مردوں کا چہرہ عورتوں کے لیے فتنہ کا سبب ہے۔ کیا مرد بھی سد ذریعہ کے لیے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیں؟ اس سے ثابت ہوا کہ واجب چہرے کا چھپانا نہیں، بلکہ نگاہیں نیچی کرنا ہے۔

ہر مذہب کے فقہا نے اس رائے کی تائید کی ہے کہ فتنہ کا باعث شہوت کی نظر ہے؟ اور اس نگاہ کو نیچا کرنا واجب ہے نہ کہ چہرے کو چھپانا۔ علاء الدین الحصکفی کی فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' (صفحہ ٦٦) میں ہے: ''عورت کے چہرے کو شہوت کی نظر سے دیکھنا ناجائز ہے جس طرح چٹ صفا (امرد) نابالغ لونڈے کے چہرے کو دیکھنا ناجائز ہے۔ مگر شہوت کے بغیر اسے دیکھنا جائز ہے، خواہ خوب صورت ہی کیوں نہ ہو۔'' ''ردالمختار'' (١:٣٩٩) میں لکھا ہے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کہ ''اگر چپٹ صفا نابالغ لڑکا خوب صورت ہو تو اس کا وہی حکم ہے جو خوب صورت عورت کا حکم ہے۔ شہوت کی نگاہ اس پر ڈالنا ناجائز ہے، مگر بغیر شہوت کے اسے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے اسے نقاب پہننے کا حکم نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس حکم میں وہ لونڈا ابھی شامل ہے جس کے منہ پر ابھی تازہ تازہ سبزہ اگا ہو، کیونکہ بعض بدمعاش ایسے لونڈے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عورت کے چہرے کو نابالغ لونڈے کے چہرے کے ساتھ تشبیہ دینے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ لونڈے کے چہرے پر شہوت کی نظر ڈالنا زیادہ گناہ کا باعث ہے، کیونکہ اس سے فتنہ کا احتمال زیادہ ہے۔'' جب امرد اور عورت کے چہرے کا ایک حکم ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عورت کو چہرہ چھپانے کا حکم دیا جائے اور نابالغ لونڈے پر اس حکم کا اطلاق نہ ہو۔ فتنہ کا سبب چہرہ نہیں، بلکہ مرد کی لذت بھری نگاہ ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مرد کی شرارت کی سزا عورت کو دی جائے۔ علامہ البانی نے معروف حنبلی عالم ابن مفلح کی کتاب ''الآداب الشرعیہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے جلباب المراۃ (صفحہ ۸) میں لکھا ہے کہ ابن مفلح نے سوال اٹھایا ہے کہ اگر اجنبی عورتیں راستہ چلتے ہوئے اپنا چہرہ کھلا رکھیں تو ان کو منع کرنے کا کوئی جواز ہے؟ اس کے جواب کا دارومدار اس سوال پر ہے کہ کیا عورت کے لیے چہرہ چھپانا واجب ہے یا یہ واجب ہے کہ اسے دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لی جائیں؟ اس مسئلہ کے بارے میں دو اقوال ہیں:

قاضی عیاض حضرت جریر سے مروی حدیث کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نگاہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نگاہ پھیر لوں (مسلم کو) بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ علما کا قول ہے۔ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ راہ چلتی عورت پر چہرہ چھپانا واجب نہیں، یہ اس کے لیے محض مستحب ہے (مگر) مرد پر واجب ہے کہ وہ ہر حال میں اسے دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لے۔ ہاں شرعی غرض سے اسے دیکھ سکتا ہے۔ شیخ محی الدین النووی نے اس روایت کا ذکر کر کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔

پھر مفلح نے امام ابن تیمیہ کے قول کا ذکر کیا ہے جو جمہور علما، قاضی عیاض اور نووی کی موافقت کے خلاف ہے۔ اس کے بعد مفلح نے کہا ہے: ''بنا بریں اختلافی مسائل میں انکار کا کوئی جواز نہیں۔ جہاں تک ہمارے (ابن مفلح) قول اور شوافع وغیرہ کی ایک جماعت کے قول کا تعلق ہے تو اجنبی عورت کو بغیر شہوت اور خلوت کے دیکھنا جائز ہے، اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔'' یہ ابن مفلح کا قول ہے جس کے بارے میں ابن قیم جوزی کہتے ہیں: ''فلک کے نیچے امام احمد کے مذہب کو ابن مفلح سے بڑھ کر جاننے والا کوئی نہیں۔''

حافظ ابوالحسن ابن القطان الفاسی نے نظر کے مسئلہ کو اپنی کتاب ''النظر فی احکام النظر'' میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ مرد کے لیے نگاہیں نیچی کرنا واجب ہے نہ کہ عورت کے لیے اپنا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

چہرہ چھپانا۔امام ابن تیمیہ نے ''مجموع فتاویٰ'' (۱۵:۴۱۴۔۴۲۷) میں غض بصر کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ انھوں نے ایک جملے (۱۵:۴۱۹) میں یہ کہہ کر پیش کیا ہے: ''جو نظر فتنے کا باعث ہو وہ حرام ہے۔ ہاں کسی قابل ترجیح ضرورت کے تحت مثلاً شادی یا علاج کی غرض سے جائز ہے، مگر اس میں بھی شہوت کا شائبہ نہ ہو۔'' فتاویٰ کے صفحہ (۱۵: ۴۲۰) پر انھوں نے مسند کی روایت پیش کی ہے کہ ''نظر شیطان کے تیروں میں سے زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ہے۔'' اور مسند کی روایت ہے: ''جو آدمی عورت کے حسن و جمال کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیتا ہے۔ اللہ اس کے دل میں عبادت کی لذت ڈال دیتا ہے جو اسے تا قیام قیامت حاصل ہوتی رہتی ہے۔اسی لیے کہا یہ گیا ہے کہ عورت اور خوب صورت چپٹ صفا نابالغ لڑکے کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کرنے سے تین بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔'' فوائد کی تفصیل طوالت کا باعث ہے، اس لیے میں اسے قلم زد کرتا ہوں۔ انھوں نے امرد پرست صوفیا کی جو لونڈے کے چہرے میں جمال حقیقی ڈھونڈتے ہیں، خوب خبر لی ہے۔ بہر کیف امام صاحب کی تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فتنے کو روکنے کا ذریعہ غض بصر ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۱۔ فتنے کا ماخذ مرد کی شہوت بھری نظر ہے جسے روکنے کے لیے قرآن حکیم نے غض بصر کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' (۱:۱۹۲) کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''عورت اگر کسی اجنبی مرد کے یا غیر مسلم عورت کے سامنے ہو تو سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے اس کا سارا بدن ستر ہے۔ اگر فتنہ کا ڈر نہ ہو تو ان دونوں کو دیکھنا جائز ہے۔'' گویا کہ نظر فتنہ کا باعث ہے۔

۲۔ یہ شرط کہ اگر فتنہ کا ڈر نہ ہو تو عورت کے چہرے اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز ہے، یہ شرط جس طرح مرد پر عائد ہوتی ہے بالکل اسی طرح خواتین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مرد بھی سد ذریعہ کے لیے چہرہ چھپالیں؟ سد ذریعہ کے لیے قرآن نے جو حکم عورتوں کو دیا ہے وہی حکم مردوں کو دیا ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں نہ کہ چہرہ چھپالیں۔ غض بصر ہی وہ ذریعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ کو روکنے کے لیے مقرر کیا ہے۔

۳۔سوال یہ ہے کہ یہ فتنہ کوئی دائمی صورت ہے یا عارضی؟ اگر عارضی ہے تو یہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوگا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا دور گزرا ہے جو اس جنسی فتنے اور اخلاقی گراوٹ سے پاک ہو؟ عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا یہ دور فتنے سے پاک نہیں تھا؟ اگر یہ پاک تھا تو پھر اصل حکم لاگو تھا کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں کیونکہ 'اذا فات الشرط فات المشروط' اور یہی ہمارا موقف ہے کہ اس عہد باسعادت میں چہرے کا چھپانا واجب نہ تھا۔

اگر فتنہ ایک عارضی ضرورت ہے تو پھر اصل حکم ہی چلے گا۔ کیونکہ عارضی حالات سد ذریعہ نہیں بن سکتے۔ صاحب مضمون اپنے موقف پر جو دائمی ہے اور فتنہ کی شرط جو عارضی ہے، از سر نو غور فرمائیں۔ متاخرین فقہا کی یہ شرط بھی ان کے موقف کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتی۔

۴۔ فتنے کی یہ شرط باطل ہے، کیونکہ یہ صفات الٰہیہ میں سے اللہ کی صفت علم کا ایک طرح کا استدراک ہے۔ اللہ کا علم ماضی اور مستقبل پر محیط ہے۔ عورت کا فتنہ تو ابتدائے آفرینش سے موجود ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں کہ اس کے لیے کسی خاص حکم کی ضرورت پڑتی۔ جیسا کہ فضل بن عباس اور خثعمیہ کے قصے سے ظاہر ہے کہ یہ فتنہ عہد نبوت میں بھی موجود تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف فضل کی نظر موڑی خثعمیہ کو منہ چھپانے کا حکم نہ دیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب اللہ نے عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیا تو پیش نظر اسی فتنہ کو روکنا تھا۔ اللہ نے عورتوں کو چہرے اور ہتھیلیاں چھپانے کا حکم نہیں دیا۔

سورۂ حجرات کی پہلی آیت میں حکم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ دین کو اس حد تک نہ پہنچاؤ جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم نہ دیا ہو۔ اس مبالغہ آمیزی سے بچنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا ہے: دین میں مبالغہ سے بچو، تم سے پہلے لوگ محض اس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے دین میں مبالغہ کیا۔

۵۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ چہرہ ستر میں شامل نہیں، مگر زمانے کے بگاڑ اور سد ذریعہ کے پیش نظر اس مسلک کی اشاعت ٹھیک نہیں، ان سے گزارش ہے کہ جو شرعی حکم کتاب وسنت سے ثابت ہوا سے فتنے کی علت کی بنا پر چھپانا کتمان حق ہے اور انسانیت کے حق میں بہت بڑا ظلم۔ اللہ تعالیٰ سورۂ بقرہ (۲: ۱۵۹) میں فرماتا ہے: ''جو لوگ ان باتوں کو چھپاتے ہیں جو سچائی کی روشنیوں اور رہنمایوں میں سے ہم نے نازل کی ہیں۔ اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

۶۔ اللہ کی فطرت کے مطابق بناوٹی زیبایش کے بغیر محض چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھنا کوئی فتنہ نہیں۔ فتنہ کا سب سے بڑا سبب مقامی عادات اور تقالید کی وجہ سے نکاح میں دشواریاں پیدا کرنا اور زنا کو آسان کرنا ہے۔ نکاح میں آسانیاں پیدا کرو، اسراف کو چھوڑ دو، حق مہر کی رقم کو حسب استطاعت مقرر کرو، بچوں اور بچیوں کی صحیح تربیت کرو فتنہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ گز بھر کا کپڑا منہ پر ڈالنے سے نہ فتنہ ختم ہوا ہے نہ ہو گا۔

مالکی مسلک پر گفتگو سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو صاحب مضمون نے دیدہ ودانستہ پیدا کرنے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کی کوشش کی ہے۔امام ابوبکر الجصاص کا نہایت ہی واضح موقف ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔ چنانچہ وہ احکام القرآن (۳:۳۷۲) میں 'الا ما ظھر منھا ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''یہ اس بات پر دلیل ہے کہ چہرہ بھی ستر میں شامل نہیں۔ وہ کھلے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ نماز پڑھتی ہے، اگر یہ ستر میں شامل ہوتے تو ان کا چھپانا ان پر واجب ہوتا۔ اگر بات یہ ہے تو اجنبی کے لیے بغیر شہوت کے عورت کا چہرہ اور ہاتھ دیکھنے جائز ہیں۔'' امام صاحب نے کہیں فتنہ کا ذکر نہیں کیا۔ صاحب مضمون نے غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے ان کی سورۂ احزاب کی تفسیر کو فتنہ کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ حالاں کہ میں واضح کر چکا ہوں کہ سورۂ احزاب کا حکم صرف مزاحمت اور ایذا رسانی کی صورت میں ہے۔ اس میں نہ پردے کا دائمی حکم ہے اور نہ اس کی مقدار کا تعین ہے۔ یہ حکم سورۂ نور کی آیات میں ہے۔ چنانچہ امام جصاص نے جن الفاظ کا اس عبارت کے ساتھ ذکر کیا ہے، اسے صاحب مضمون نے جان بوجھ کر حذف کر دیا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں: ''حسن سے روایت ہے کہ مدینہ کی لونڈیاں تھیں جن کو یہ کہا جاتا تھا۔ وہ باہر نکلتیں تو بدمعاش ان کے منہ لگتے اور ان کو ایذا پہنچاتے۔ جب آزاد عورت باہر نکلتی تو وہ اسے بھی لونڈی سمجھ کر درپے آزار ہوتے۔ پس اللہ نے ان کو جلباب نیچے کرنے کا حکم دیا تاکہ پتا چلے کہ وہ آزاد ہیں اور ان کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ اللہ نے آزاد عورت کو حکم دیا ہے کہ جب وہ نکلے تو لونڈیوں کے برعکس اپنا سر اور پیشانی ڈھانپ لے۔'' امام صاحب نے حسن کا قول بھی نقل کر دیا ہے اور ابن عباس کا بھی جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ خاص حالات میں ایک خاص حکم ہے۔ اسے ہر زمانے میں، ہر حالت میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ امام ابوبکر جصاص نے ''احکام القرآن'' (۳:۲۱۶) میں ابن مسعود کے قول کہ 'الا ما ظھر منھا ' سے مراد ظاہری لباس ہے، کو بے معنی قرار دیا ہے۔ اس کا حوالہ میں اصل مضمون میں دے چکا ہوں۔

امام مالک کا مسلک

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ امام مالک کا مسلک بھی یہی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔ ان کے قول کے ساتھ فتنہ کا کہیں ذکر نہیں۔ فقہ مالکی کی چار بنیادی کتابیں ہیں: ''المدونة لسحنون''، ''الواضحة لابن حبیب''، ''العتبیة للعتبی''، (عتبی ابن حبیب کا شاگرد تھا) اور ''الموازیة لابن مواز''۔ یہ کتابیں غالباً صاحب مضمون نے دیکھی نہ ہوں گی۔ ان میں سے کسی کتاب میں فتنے اور ستر کی وجہ سے چہرے کے پردے کے وجوب کی بات نہیں ملتی۔

صاحب مضمون نے موطا میں مروی حدیث پر امام زرقانی کی عبارت نقل کرنے میں پوری دیانت داری کا ثبوت

www.javedahmadghamidi.com

نہیں دیا۔ یہ حدیث 'سدل' کی بحث میں ہے نہ کہ چہرہ ڈھانپنے کی بحث میں۔ امام زرقانی فرماتے ہیں: ''ابن منذر کا قول ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت سلا ہوا کپڑا اور موزے پہنے اور اپنا سر اور بال ڈھانپ لے بجز چہرے کے۔ اس پر معمولی سا 'سدل' (سر کے اوپر سے کپڑا لٹکا لے جو چہرے کو نہ چھوئے) کرے جس سے وہ مردوں کی نگاہوں سے بچی رہے۔ اسے ڈھانپے نہیں۔ ہاں فاطمہ بنت منذر کی ایک روایت ہے۔ احتمال ہے کہ اس 'تخمیر' (ڈھانپنے) سے مراد 'سدل' ہے جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت میں ہے۔ 'سدل' کی اجازت بھی بوقت ضرورت ہے جب مرد بہت قریب ہوا اور لذت کی نظر سے دیکھنے لگے۔'' یہ ہے امام زرقانی کی عبارت۔ 'سدل' والی روایت کو فتنہ کے ڈر سے چہرے کے پردے کے وجوب کے لیے پیش کرنا مضمون نگار کا کمال ہے۔

صاحب مضمون کو اتنا بھی پتا نہیں کہ شیخ احمد الدردیر کی کتاب کا نام 'اقرب المسالك الی مذهب الامام المالك' ہے اور اس کی ''الشرح الصغیر'' صاوی کی ہے۔ لگتا ہے کہ انھوں نے کسی اور کتاب سے حوالہ نقل کیا ہے۔ ''الشرح الصغیر'' (۱:۱۰۵) میں ہے: آزاد عورت کا سارا بدن بجز چہرے اور ہاتھوں کے ستر ہے۔ بس ان دونوں کو بغیر لذت اور وجدان کے دیکھنا جائز ہے وگرنہ ان کو دیکھنا حرام ہے۔ ہاتھوں کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں۔ کیا عورت پر اس فتنۂ لذت نظر کی صورت میں چہرے اور ہاتھوں کو ڈھانپنا واجب ہے؟ یہ رائے ابن مرزوق کی ہے جس کا قول ہے کہ امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے یا عورت کے لیے ان دونوں کا چھپانا واجب نہیں، بلکہ مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لے۔ ''المواقف'' نے قاضی عیاض کا جو قول نقل کیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے۔ تیسری رائے کو زروق نے ''شرح الوعلیشیہ'' میں نقل کیا ہے کہ چہرے کو چھپانا صرف خوب صورت عورت پر واجب ہے، جبکہ دوسری کے لیے مستحب ہے۔ اس میں صاف طور پر تین نقطہ ہائے نظر کا ذکر ہے، مگر صاحب مضمون نے اس سے یہ کیسے اخذ کر لیا کہ فقہ مالکی میں چہرے کے پردے کا وجوب فتنہ کے سبب سے ہے اور قاضی عیاض اور زروق کے نقطۂ نظر کو نظر انداز کر دیا۔

صاحب مضمون نے امام قرطبی اور ابن العربی کے حوالوں میں اسی حیلہ گری سے کام لیا ہے جو انھوں نے ابوبکر الجصاص کے حوالہ میں استعمال کی تھی۔ یہ دونوں حوالے سورۂ احزاب کی آیت کے سلسلہ میں ہیں جو ایک خاص حکم ہے۔ کاش وہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۰ کے بارے میں ان کا حوالہ دیکھ لیتے۔ امام قرطبی اپنی تفسیر (۱۲:۲۲۶) میں سورۂ نور کی آیت کے تحت ابن عطیہ کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن عطیہ کا قول خوب ہے، مگر عادتاً اور عبادتاً اکثر و بیشتر چہرہ اور ہاتھ کھلے رہتے ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ استثنا ان دونوں کے بارے میں ہو پھر انھوں نے

دلیل کے طور پر ابوداؤد میں حضرت عائشہ سے مروی (مرسل) روایت کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ احتیاطاً لوگوں کے بگاڑ کے پیش نظر یہی بات قوی ہے۔ پس عورت اپنی زینت میں سے وہی ظاہر کرے جو اس کے چہرے اور ہاتھوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ہے امام قرطبی کا مسلک نہ کہ وہ جو مزاحمت اور ایذا رسانی کی صورت میں ہے۔ ابن العربی ''احکام القرآن'' (۱۳۶۹:۳) میں فرماتے ہیں کہ ''درست بات یہ ہے کہ ہر لحاظ سے اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں، کیونکہ یہی عادتاً اور عبادتاً کھلے رہتے ہیں۔ حالت احرام میں بھی اور نماز میں بھی یہی استثنا کا سبب ہے۔'' یہ دونوں مالکی ائمہ امام مالک کی نمایندگی کرتے ہیں۔

مشہور مالکی اسکالر ابن رشد (المتوفی ۵۲۰ھ) اپنی کتاب ''مقدمات ابن رشد لبیان ما اقتضته المدونة من الاحکام'' (۱۰۹:۱) میں لکھتے ہیں کہ ''یہ فصل اس بارے میں ہے کہ نماز میں عورت پر کتنا ستر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: 'الا ما ظهر منها' جب آزاد عورت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر محرم کے سامنے صرف اس زینت کو ظاہر کرے جو خود بخود نظر آ جائے اور اہل علم کے قول کے مطابق اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔ یہی بات اس پر نماز میں واجب کی گئی ہے۔ اسے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔''

انھی کے پوتے ابن رشد (المتوفی ۵۹۵ھ) ''بدایۃ المجتہد'' (۸۳:۱) میں فرماتے ہیں کہ اکثر علما کا یہی مذہب ہے کہ ''چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا عورت کا سارا بدن ستر میں شامل ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے کہ قدم بھی ستر میں شامل نہیں۔''

مشہور مالکی عالم شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی (۶۸۴ء) اپنی مشہور کتاب ''الذخیرہ'' (۱۰۵:۲) میں لکھتے ہیں: ''عورتوں کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہاتھوں کے ستر ہے... ابن حنبل نے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو ڈھانپنا واجب قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ نہ احرام میں ستر ہے اور نہ نماز میں۔'' اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۴/۲ پر 'الا ما ظهر منها' کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ آزاد عورت کا چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ رکھے جائیں، کیونکہ ضروری کاموں کے وقت یہی کھلے رہتے ہیں۔

امام حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر النمری القرطبی (۴۶۳ھ) فقہ مالکی کے امام ہیں اور ان کی کتاب ''التمہید'' فقہ مالکی کا شاہ کار ہے۔ اس کتاب (۳۶۴:۶) میں وہ لکھتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ عورت اپنا چہرہ نماز اور احرام میں کھلا رکھے گی۔ امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی اور ان کے اصحاب، امام اوزاعی اور ابوثور کا قول ہے کہ عورت پر واجب ہے کہ وہ چہرے اور ہاتھوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ڈھانپ لے۔ میرے خیال میں امام مالک کا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مسلک بیان کرنے کے لیے علامہ ابن عبدالبر سے بڑھ کر اور کس کا قول وزنی ہو سکتا ہے؟

ان کا قول امام مالک کے بارے میں ابن تیمیہ کے قول سے زیادہ وزنی ہے۔ یہی امام ''التمہید'' (۱۰: ۱۰۷۔ ۱۰۹) میں حضرت عائشہ کی روایت کہ اگر عورت چاہے تو حالت احرام میں 'سدل' کر سکتی ہے، بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ وہ 'سدل' نہ کرے اور اس پر لوگوں کا عمل ہے۔

مقام حیرت ہے کہ امام مالک کا مسلک بیان کرتے وقت نہ ان کی نظر ''التمہید'' پر پڑی، نہ ''مقدمات ابن رشد'' پر، نہ قرافی کی ''الذخیرۃ'' پر اور نہ ابن رشد کی ''بدایۃ المجتہد'' پر، نظر پڑی تو متاخرین کی شروح پر اور ان کا حوالہ دیتے وقت بھی انھوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔

خلاصۂ بحث

۱۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو ستر میں شامل نہیں کرتے۔ قدم بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک ستر میں شامل نہیں، کیونکہ اللہ کا قول ہے 'الا ما ظھر منھا' جس سے مراد ابن عباس کے قول کے مطابق چہرہ اور ہاتھ ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے، اگر یہ 'عورۃ' ہوتے تو ان کا چھپانا حرام نہ قرار دیا جاتا اور کیونکہ خرید و فروخت اور لین دین کے لیے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

۲۔ دونوں ائمہ کے اقوال میں فتنے کا دور دور تک کہیں ذکر نہیں اور نہ ہی متقدمین کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

۳۔ متاخرین نے اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اصل حکم یہی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں۔ دونوں ائمہ کی تقلید کا دم بھرنے کے باوجود انھوں نے انفرادی اجتہاد سے یہ شرط عائد کی ہے۔

۴۔ فتنہ ایک عارضی بات ہے، اس کا اصل حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۵۔ فتنہ یہ ہے کہ مرد عورت پر لذت بھری نگاہ ڈالے جو حرام ہے۔ اسی لیے قرآن نے سد ذریعہ کے لیے عورتوں اور مردوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ شہوت کی نگاہ عورت پر ڈالنا بھی حرام ہے اور نابالغ لونڈے (امرد) پر بھی۔ اسی لیے نگاہ کو نیچی کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، مگر عورت اور نابالغ لونڈے کے لیے چہرہ چھپانا واجب نہیں۔

۶۔ صاحب مضمون نے دونوں مذاہب کے متقدمین کی امہات الکتب کو نظر انداز کیا ہے اور کسی امام کے قول کا حوالہ نہیں دیا۔ جبکہ میرے مضمون میں سب حوالے موجود ہیں۔

حکمت قرآن کے جون ۲۰۰۶ کے شمارے میں حافظ محمد زبیر صاحب نے حنابلہ اور چہرے کے پردہ کے عنوان سے اپنے مضمون کی ساتویں اور آخری قسط پر خامہ فرسائی کی ہے۔اس کا جواب پیش خدمت ہے۔

صاحب مضمون نے چھوٹتے ہی غلط بات کہی ہے کہ متقدمین اور متاخرین حنابلہ کے نزدیک عورت کا چہرہ ستر میں شامل ہے۔حوالہ جات میں انھوں نے امام احمد بن حنبل کے دونوں اقوال اور متقدمین کی رائے سے پہلوتہی کرتے ہوئے صرف متاخرین کی شروح اور شروح پر حاشیوں کے حوالوں پر اکتفا کیا ہے۔

ہر مکتب فکر کی فقہ کی اہم کتابوں میں ''ستر العورۃ'' کے باب میں لکھا ہوا ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔کیونکہ سورۂ نور کی آیت 'الا ما ظھر منھا' سے مراد ابن عباس، حضرت عائشہ اور ابن عمر کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں اور چونکہ خرید وفروخت کے وقت چہرے کو اور لین دین کے وقت ہاتھوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے اور چونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام والی عورت کو نقاب اوڑھنے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے اگر چہرہ ستر میں شامل ہوتا تو ان اعضا کے چھپانے کو حرام قرار نہ دیا جاتا۔

امام احمد بن حنبل کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ایک تو وہی جو ائمۂ ثلاثہ کا مسلک ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا واجب نہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ چہرہ اور ہاتھ بھی ستر میں شامل ہیں اور ان کا چھپانا واجب ہے۔

یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ حنبلی الشیبانی (۵۶۰ھ) اور ابن قدامہ حنبلی (۶۲۰ھ) فقہ حنبلی کے ستون ہیں اور ان کی رائے فقہ حنبلی میں قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ان دونوں حضرات نے امام صاحب کے پہلے قول کی تائید کی ہے اور اسے درست قول قرار دیا ہے۔

ابن ہبیرہ حنبلی اپنی کتاب ''اختلاف أئمۃ العلماء'' (ص۱۰۲) میں لکھتے ہیں: ''آزاد عورت کے ستر سے متعلق علما میں اختلاف ہے۔ابوحنیفہ کا قول ہے کہ عورت کا سارا بدن بجز چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے ستر میں شامل ہے۔ان سے ایک روایت یہ ہے کہ عورت کے پاؤں ستر میں شامل نہیں۔ مالک اور شافعی کا قول ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا اس کا سارا بدن ستر ہے۔امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ بجز چہرے اور ہاتھوں کے سارا بدن ستر میں شامل ہے، یعنی جیسا کہ مالک اور شافعی کا مذہب ہے اور خرقی نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔'' (خرقی کا نام ابوالقاسم عمر بن حسین بن عبداللہ بن احمد الخرقی (۳۳۴ھ) ہے۔ابن قدامہ نے ان کی مختصر کو اپنی کتاب المغنی کی بنیاد قرار دیا ہے)۔ابن ہبیرہ نے اپنی کتاب ''الافصاح'' میں بھی یہی بات کہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ابن قدامہ حنبلی ''المغنی'' (۱: ۶۳۹) میں لکھتے ہیں کہ ''مالک، اوزاعی اور شافعی کا قول ہے کہ آزاد عورت کا سارا بدن سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر میں شامل ہے، کیونکہ اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' کے بارے میں ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں اور کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو حالت احرام میں نقاب اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ اگر چہرہ اور ہتھیلیاں 'عورۃ' (ستر) ہوتیں تو ان کے چھپانے کو حرام قرار نہ دیا جاتا اور چونکہ خرید وفروخت کے لیے چہرہ اور لینے دینے کے لیے ہاتھوں کو کھلا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''المغنی'' (۷: ۴۶۲) میں ہے کہ ''امام احمد نے حضرت اسماء کی اس حدیث سے استشہاد کیا ہے کہ جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو مناسب نہیں کہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ کوئی اور چیز نظر آئے... اس سے پتا چلتا ہے کہ امام احمد کا چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھنے والا قول زیادہ درست ہے۔''

حیرت ہے صاحب مضمون نے موضوع زیر بحث پر اس واضح حوالہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ''المغنی'' کا صرف ایک بار ذکر کیا ہے۔ وہ بھی 'سدل' کے حوالہ سے، جس کا موضوع سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ ('سدل' پر بحث میں چوتھی قسط کے جواب میں کر چکا ہوں) یہ ذکر بھی حنابلہ کے موقف کے تحت نہیں ہے، بلکہ مضمون کے آخر میں ''چہرے کے پردے پر تمام مسلمان علما کا اتفاق'' کے عنوان کے تحت ہے۔ 'سدل' کے بارے میں بھی ابن قدامہ کا وہی مسلک ہے جو دوسرے علما کا ہے کہ صرف بوقت ضرورت اگر مرد عورتوں کے قریب تر ہوں تو وہ 'سدل' (چہرہ چھپانا نہیں) کر سکتی ہیں یعنی اس کی اجازت ہے یہ واجب نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

علامہ ابن مفلح حنبلی نے اپنی کتاب ''الآداب الشرعیۃ'' (۱: ۲۷۵۔۲۷۶) میں ایک سوال اٹھایا ہے کہ اگر اجنبی عورتیں راستوں میں اپنے چہرے کو کھلا رکھیں تو کیا ان کے اس فعل سے انکار کا کوئی جواز ہے؟ پھر وہ خود ہی کہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آیا ان کے لیے چہرہ چھپانا واجب ہے یا (انھیں دیکھ کر) نظریں نیچی کر لینا واجب ہے؟ اس مسئلہ کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ مسلم میں حضرت جریر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نظر کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے مجھے نگاہیں پھیرنے کا حکم دیا۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ علما کا قول ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ راستوں میں عورت کے لیے چہرہ چھپانا واجب نہیں، بلکہ مستحب ہے، مگر مرد پر ہر حالت میں نگاہیں نیچی کرنا واجب ہے، اسی بات کو شیخ محی الدین نووی نے بھی بیان کیا ہے اور اس میں اور کسی بات کا اضافہ نہیں کیا۔ پھر ابن مفلح نے ابن تیمیہ کے قول کا بھی ذکر کیا ہے اور پوچھا ہے، کیا اس اختلاف کی بنا پر انکار جائز ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ ہمارے (حنبلیوں) قول کے مطابق اور

شافعیوں وغیرھم کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اجنبی عورت کو بغیر شہوت اور خلوت کے دیکھنا جائز ہے، اس لیے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ابن مفلح کے اس قول کو قاضی عیاض اور امام نووی کی تائید حاصل ہے۔

اکثر حنبلی فقہا نے خرقی، ابن ہبیرہ اور ابن قدامہ کا تتبع کرتے ہوئے امام احمد بن حنبل کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ عورت کا سارا بدن ستر ہے۔

فقہ حنبلی کی مشہور کتاب ''الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف'' (۱:۴۱۷) تالیف ابوالحسن علی بن سلیمان بن احمد المرداوی السعدی الحنبلی (۸۸۵ھ) میں لکھا ہے: ''اور آزاد عورت کا ناخنوں اور بالوں سمیت پورا جسم سوائے چہرے کے ستر میں شامل ہے۔امام احمد کا یہی مذہب صحیح ہے کہ چہرہ ستر میں شامل نہیں (جیسا کہ المغنی (۱:۶۳۷) اور الشرح الکبیر (۱:۴۵۸) میں ہے) اور یہی ہمارے اصحاب کا مذہب ہے۔اور قاضی (عیاض) نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے امام احمد کے دوسرے قول کا ذکر کیا ہے کہ چہرہ بھی ستر میں شامل ہے۔

''العدة شرح العمدة'' (۱:۶۹) تالیف بہاء الدین عبدالرحمان ابراہیم المقدسی، فقہ حنبلی کی ایک اور مشہور کتاب ہے۔''العمدہ'' میں ہے کہ ''آزاد عورت کا پورا جسم سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر ہے۔'' ''العدة'' میں اس کی تشریح یوں ہی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول 'الا ما ظهر منها' ہے اور ابن عباس کا قول ہے: ''سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے۔'' اور چونکہ حالت احرام میں چہرے کو نقاب سے چھپانا اور ہتھیلیوں کو دستانوں سے چھپانا حرام ہے۔ اگر وہ 'عورة' ہوتے تو ان کو چھپانا حرام نہ ہوتا۔اللہ تعالیٰ کا قول: ''سوائے اس زینت کے جو ظاہر ہو جائے''، ابن عباس کا قول کہ اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں اور حالت احرام میں ان اعضا کو کھلا رکھنا۔تین ایسی دلیلیں ہیں جو ہر مسلک کی فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا دوسرا قول ہے کہ عورت کا پورا بدن ناخنوں سمیت ستر میں شامل ہے۔صاحب مضمون نے اسی قول کا سہارا لیا ہے، حالاں کہ متقدمین حنابلہ نے پہلے قول کو درست سمجھا ہے اور اکثر فقہا کا اسی پر عمل ہے۔

امام احمد کے دوسرے قول کے مضمرات:

مضمون نگار نے اگر فقۂ حنبلی کا مربوط مطالعہ کیا ہوتا تو وہ امام صاحب کے دوسرے قول کے مضمرات کو خوب سمجھ گئے ہوتے، مگر وہ تو اپنے مزعومہ تصور کو ثابت کرنے کے لیے حاطب اللیل کی طرح ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے

ہیں۔ دوسرے قول کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ عورت نماز میں بھی اپنا چہرہ چھپائے گی۔ اور جیسا کہ بعض متاخرین نے کہا ہے کہ وہ سجدہ کرتے وقت نقاب چہرے سے اٹھا لے گی اور سجدہ کرنے کے بعد دوبارہ نقاب چہرے پر ڈال لے گی۔ اس مسلک پر آج تک کسی نے عمل نہیں کیا۔

امام ذھبی ''التنقیح'' (۱:۲۰۹) میں فرماتے ہیں: ''احمد بن حنبل کا قول ہے کہ عورت اس حالت میں نماز پڑھے گی کہ اس کا ناخن تک نظر نہ آئے گا۔'' امام ابن تیمیہ ''حجاب المراۃ المسلمہ'' مطبوعہ مکتبۃ المعارف الریاض (ص ۸) میں فرماتے ہیں کہ ابن مسعود نے یہ کہا ہے کہ ظاہری زینت سے مراد کپڑے ہیں، مگر یہ نہیں کہا کہ وہ ناخنوں سمیت ساری کی ساری ستر ہے، بلکہ یہ قول احمد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو نماز میں بھی چھپائے گی۔ ابن تمیم نے بھی ان سے روایت کی ہے کہ وہ ساری کی ساری ستر ہے۔

یہ قول اس لیے ناقابل عمل ہے کہ آج تک نماز میں چہرہ چھپایا نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا کو ابن حنبل کے اس قول کی توجیہ کی ضرورت پڑی۔ ابن مفلح کو ''المبدع'' (۱:۳۶۳) میں کہنا پڑا کہ امام احمد کے اس مطلق قول کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ یا تو چہرے کے سوا سارا جسم ستر ہے یا اس سے مراد نماز سے باہر کا ستر ہے۔ صاحب ''الانصاف'' نے بھی زرکشی کے حوالہ سے یہی بات کہی ہے۔ کیونکہ یہ فقہا سمجھتے تھے کہ امام احمد کا یہ قول اجماع امت کے خلاف ہے۔ لیکن ابن قدامہ، صاحب ''المغنی'' نے تو صرف چہرے کے استثنا کے احتمال کا ذکر کیا ہے اور نماز سے باہر ستر کے احتمال کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

امام موفق الدین بن قدامہ نے ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث کے قول کہ ''عورت ساری کی ساری ستر ہے۔'' کی توجیہ یہ کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ''عورت ساری کی ساری ستر ہے۔''، عام اور مطلق قول ہے جس کی تخصیص اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' اور صحیح احادیث سے کی گئی ہے۔ یہی بات اگر امام احمد کے دوسرے قول کے بارے میں کہی جاتی تو نماز سے باہر ستر کے حیلہ کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن متاخرین فقہا نے خرقی، ابن ہبیرہ اور ابن قدامہ جیسے متقدمین کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے نماز کے اندر اور باہر کے ستر کا تصور تراشا۔ ابن قدامہ (۶۲۰ھ) کی ایک اور کتاب ''المقنع'' ہے۔ اس میں یہ عبارت ہے کہ ''بالغ آزاد عورت کا سارا بدن سوائے چہرے کے ستر ہے۔'' ابن مفلح (۸۸۴ھ) نے ''مقنع'' کی شرح ''المبدع'' (۱:۳۹۳) میں ''المقنع'' کی عبارت 'الا الوجہ' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''(حنبلی) مذہب میں اس بات پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت نماز میں اپنا چہرہ کھلا رکھے گی۔'' مفتی حنابلہ موسیٰ الحجازی (۹۶۸ھ) نے اپنی کتاب 'زاد المستقنع' میں 'المقنع' کا اختصار کیا

ہے۔ وہ بھی اس کتاب (۱:۵۷) میں وہی الفاظ لکھتے ہیں جو ابن قدامہ نے لکھے ہیں، یعنی آزاد عورت کا سارا بدن بجز چہرے کے ستر میں شامل ہے۔ انھوں نے بھی نماز کے اندر اور باہر کے ستر کی کوئی بات نہیں کی۔ صرف ''المقنع'' کی شروح میں اس بات کا ذکر ہے کہ چہرہ نماز میں ستر نہیں۔ یہ نقطۂ نظر بعض متاخرین کا ہے، متقدمین کا نہیں۔

علاء الدین ابی الحسن علی بن سلیمان المرداوی (۸۸۵ھ) نے ''التنقیح المشبع فی تحریر احکام المقنع'' میں 'المقنع' کی عبارت 'کلہا عورۃ' کے تشریحاً 'فی الصلاۃ' (نماز میں) کے الفاظ لکھے ہیں۔ ''زاد المستقنع'' کی شرح منصور بن یونس البہوتی (۱۰۵۱) نے 'الروض المربع' کے نام سے کی ہے۔ اس میں انھوں نے 'زاد المستقنع' کے الفاظ پر اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''چہرہ نماز میں ستر نہیں۔'' (۱:۵۷) یہی بات ''منار السبیل'' (ص ۱۰۸) اور ''دلیل الطالب'' (ص ۲۶) کے مصنفین نے کہی ہے۔

مگر صالح بن ابراہیم البلیہی نے ''زاد المستقنع'' کا حاشیہ 'السلسبیل فی معرفۃ الدلیل' (۱:۷۳) لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں: ''آزاد عورت کا پورا جسم سوائے چہرے کے ستر ہے اور یہ تشریح ہے حضرت عائشہ کی اس روایت کی کہ اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔ اس روایت کو سوائے نسائی کے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن گردانا ہے، مگر انھوں نے دیانت داری سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ امام احمد سے روایت ہے کہ سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے اس کا سارا جسم ستر ہے اور اس روایت میں وہ امام مالک اور شافعی سے متفق ہیں۔ اور ابو عشفہ کا قول ہے کہ سوائے چہرے، ہتھیلیوں اور پاؤں کے عورت ساری کی ساری ستر ہے۔''
آپ نے دیکھا کہ نہ ''المقنع'' کے مصنف نے اور نہ ہی ''زاد المستقنع'' کے مصنف نے چہرے کے ستر کے عدم وجوب کو نماز کے ساتھ مقید کیا ہے۔ یہ قید صرف بعض متاخرین نے اپنی افتاد طبع کی بنیاد پر لگائی ہے۔ جس کی کوئی دلیل کتاب و سنت میں موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں میں ''حکمت قرآن'' بابت جولائی ۲۰۰۶ کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ صفحہ ۹۰ پر ہے:

''جہاں تک متاخرین فقہا کا تعلق ہے ان کو صرف نئی مشکلات پر گفتگو کرنی چاہیے صدر اول کے لوگوں کے فہم کے خلاف ان کو شرعی مسائل میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ وہ اس لغت تخاطب کو سمجھتے تھے جو صحابہ کے درمیان متداول تھی اور جس میں ابھی تک کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے ان لوگوں سے علم حاصل کیا تھا جو زمانۂ وحی میں موجود تھے۔ شریعت کا وہی مفہوم درست ہے جو انھوں نے سمجھا اور جس چیز کو انھوں نے بطور دلیل قبول نہیں کیا وہ دلیل نہیں ہو سکتی۔'' (مقالات الکوثری ص ۲۵۸)

اگر متاخرین میں سے کوئی شخص نصوص کے ہوتے ہوئے جمہور ائمہ اور فقہا کے متعین کردہ مفہوم کے خلاف اپنی

رائے پیش کرے گا تو اسے رد کر دیا جائے گا۔

متاخرین نے اس رائے کا اظہار سیاسی، علمی اور تحقیقی اعتبار سے زوال کے زمانہ میں کیا۔ چنانچہ شیخ محمد غزالی اپنی کتاب ''من هنا نعلم'' میں کہتے ہیں: ''چہرے کو ڈھانپنے کے بارے میں کوئی صریح نص موجود نہیں، بلکہ روایات سے چہرہ کھلا رکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، بعض فقہا نے فتنہ کو روکنے کے لیے اسے چھپانے کا فتویٰ دیا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ نقاب فتنہ کو روکنے کا ذریعہ ہے، خواہ متشددین اس کے ساتھ چپکے رہیں، بلکہ مسلمانوں نے اپنے عجز و بے بسی کے زمانے میں اس کی طرف رجوع کیا۔''

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مضمون نویس کے سارے کے سارے حوالے انھی متاخرین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ''المغنی'' اور ''الشرح الکبیر'' کا حوالہ حالت احرام میں 'سدل' کے بارے میں تو دیا ہے، مگر موضوع زیر بحث پر ابن قدامہ کے واضح اور دوٹوک موقف کو دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ بات علمی دیانت کے منافی ہے۔

مضمون میں نماز کے اندر اور باہر ستر کا الگ الگ تصور فلسفۂ ستر سے متصادم ہے اور جمہور فقہا کے موقف کے منافی۔ نماز کے اندر کا ستر وہی ہے جو نماز سے باہر کا ہے۔ نماز کے اندر جو عضو کھلا رہے گا، وہ نماز سے باہر بھی کھلا رہے گا اور نماز کے اندر جن اعضا کو چھپانا واجب ہے، نماز سے باہر بھی ان کو چھپانا واجب ہے۔ اس بات کے لیے مفسرین اور فقہا نے عادتاً اور عبادتاً کی اصطلاح استعمال کی ہے جسے میرے مضامین میں جا بجا پڑھا جا سکتا ہے۔ یعنی جو اعضا عادتاً کھلے رہتے ہیں اور جن کو چھپانے کے لیے تکلف اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ عبادت کرتے وقت بھی کھلے رہیں گے۔ بڑے ابن رشد (۵۲۰ھ) نے اپنی کتاب ''مقدمات ابن رشد لبیان ما اقتضته المدونة من الاحکام'' (۱:۱۰۹) میں لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: 'الا ما ظهر منها' (۲۴: ۳۱)... جب آزاد عورتوں کو اجنبیوں سے ستر کا حکم دیا گیا اور یہ حکم ہوا کہ وہ غیر محرم کے سامنے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا کوئی زینت ظاہر نہ کریں، جیسا کہ اہل علم نے اس آیت کی تفسیر کی ہے۔ اسی طرح اس کے لیے نماز کے دوران میں اس بات کو واجب قرار دیا گیا۔ اس واجب کو کبھی بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اور وہ کم از کم لباس جس سے نماز ادا ہو جاتی ہے، وہ ہے اوڑھنی اور مکمل قمیص جو پاؤں کے اوپر والے حصے کو چھپا لے۔ ام سلمہ نے یہی بات کہی ہے۔ یہ معروف مالکی فقیہ سورۂ نور کی آیت کو 'ستر العورة' کے بارے میں نص قطعی کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ آیت نماز تک محدود نہیں۔ شیخ الاسلام زکریا الانصاری ''شرح روض الطالب'' (۱:۱۷۶) میں لکھتے ہیں: 'عورة الحرة فی الصلاة

وعند الاجنبی ' یعنی (آزاد عورت کا نماز میں اور اجنبی مرد کے پاس ستر) خواہ نماز سے باہر ہو سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے سارا بدن ہے۔ ہتھیلیوں کے اندر اور باہر کا حصہ بند تک، کیونکہ اللہ کا قول ہے: 'الا ما ظھر منھا '، ابن عباس وغیرہ کا قول ہے جو زینت ظاہر رہتی ہے اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں، یہ ستر میں اس لیے شامل نہیں، کیونکہ ان کو کھلا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کتاب پر شیخ الشیوخ ابوالعباس احمد ابوعلی الکبیر الانصاری اور استاذ کبیر محمد بن احمد الشویری نے حاشیہ میں کہا ہے: '' کیونکہ اگر یہ دونوں اعضا ستر میں شامل ہوتے تو حالت احرام میں ان کا کھولنا واجب نہ ہوتا۔'' یہ دلیل ہر مکتب فکر کی فقہ کی کتابوں میں موجود ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیاں ستر میں شامل ہوتیں تو حالت احرام میں حدیث نبوی کے مطابق ان کا چھپانا حرام نہ ہوتا۔ میرے مضمون میں یہ حوالے موجود ہیں۔ امام غزالی اپنی کتاب ''الوجیز'' (۱:۴۸) میں فرماتے ہیں: ''ستر کو چھپانا نماز سے باہر بھی واجب ہے۔'' امام نووی ''روضۃ الطالبین'' (۱:۳۸۸) میں فرماتے ہیں کہ ''صحیح ترین قول ہے کہ ستر کو چھپانا نماز، خلوت اور خلوت کے بغیر بھی واجب ہے۔''

علامہ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز ملیباری شافعی (۹۸۷ھ) اپنی کتاب ''فتح المعین'' (۱:۲۴) میں فرماتے ہیں: ''نماز میں جو ستر ہے اسے خارج نماز میں بھی چھپانا واجب ہے۔'' سعیدالدین کاشغری اپنی کتاب ''منیۃ المصلی'' (ص ۱۷۵) میں 'عورۃ' کے باب کے تحت لکھتے ہیں: 'نماز کے بارے میں، اجنبی مردوں کے بارے میں اور کافر عورتوں کے بارے میں عورت کا ستر۔'' یہ عنوان ظاہر کرتا ہے کہ نماز کے اندر اور باہر کا ستر ایک ہے۔ میں انھی حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں جو مالکی، شافعی اور حنفی فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ابن قدامہ کی ''المغنی'' کا حوالہ تو پہلے دے چکا ہوں۔ ان حوالوں کی موجودگی میں صاحب مضمون کا یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا کہ امام احمد بن حنبل کے دونوں اقوال میں تطبیق یہ ہے کہ ایک قول نماز کے اندر ستر کے بارے میں ہے اور دوسرا نماز سے باہر۔ تطبیق وہی درست ہے جس کا ذکر ابن قدامہ نے کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل کا دوسرا قول کہ عورت کا سارا بدن یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی ستر میں شامل ہیں، ایک مطلق قول ہے جس کی تقیید اللہ کا قول 'الا ما ظھر منھا ' اور صحیح احادیث کرتی ہیں۔ ان حوالہ جات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نہ امام احمد کا پورے جسم کے ستر والا قول قابل عمل ہے اور نہ ہی یہ توجیہ قابل عمل ہے کہ نماز کے اندر کا ستر اور ہے اور باہر کا ستر اور۔

امام ابن تیمیہ کا موقف

امام موصوف نے احمد بن حنبل کے دوسرے قول کو اختیار کر کے اسے ان کا مشہور قول قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ

نے ستر کے قضیہ کو انتہائی دیانت داری سے پیش کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے مخالفین کے مسلک کا انکار نہیں کیا۔ وہ ''مجموع فتاویٰ'' (۱۵:۱۷۱) میں فرماتے ہیں: ''زینت ظاہرہ سے مراد ابن مسعود کے نزدیک اوپر والے کپڑے ہیں اور یہی امام احمد کا مشہور قول ہے اور ابن عباس کا قول ہے کہ زینت ظاہرہ سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں اور یہ امام احمد کا دوسرا قول ہے اور یہی قول علما کی ایک بڑی جماعت کا قول ہے جیسے امام شافعی وغیرہ۔'' ابن عباس کے اس قول کی تائید مجاہد نے اپنی تفسیر میں کی ہے۔ جس کے بارے میں امام ابن تیمیہ ''مجموع فتاویٰ'' (۱۷:۳۶۷) میں کہتے ہیں کہ ''مجاہد تفسیر کے امام ہیں۔'' اور اپنے فتاویٰ (۱۷:۴۰۸-۴۰۹) میں فرماتے ہیں کہ ثوری، شافعی، احمد بن حنبل اور بخاری جیسے اکثر ائمہ انھی کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔ ثوری کا قول ہے کہ اگر تمھارے پاس مجاہد کی تفسیر پہنچے تو تمھارے لیے یہی کافی ہے۔ اور شافعی اپنی کتابوں میں ابن قتیبہ اور ابن نجیح کے حوالے سے ان کی روایت نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح بخاری اپنی صحیح میں اسی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور کہنے والے کا یہ کہنا کہ ''مجاہد سے ابن نجیح کی روایت صحیح نہیں۔'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن نجیح کی روایت سے مجاہد کی تفسیر صحیح ترین تفسیر ہے۔ بلکہ اہل تفسیر کے ہاتھوں میں کوئی تفسیر نہیں جو ابن نجیح کی روایت سے مجاہد کی تفسیر سے زیادہ صحیح ہو۔ پھر اس بات کی تائید ابن نجیح کے اس قول سے ہوتی ہے کہ میں نے ابن عباس پر قرآن کو پیش کیا اور میں ہر آیت کے بارے میں ان کو روک کر ان سے سوال کرتا تھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ جلباب والی آیت (۳۳:۵۹) کے بارے میں دو آثار ہیں، ایک محمد بن سیرین کا اثر عبید سلیمانی کے حوالے سے اور دوسرے ابن نجیح کا اثر مجاہد کے حوالے سے۔ اس دوسرے اثر کے مطابق جلباب چہرے کو نہیں چھپائے گا۔ مجاہد کے بارے میں ابن تیمیہ کے خیالات کو پیش نظر رکھیں تو یہی اثر صحیح ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجاہد کی مدح سرائی کے باوصف ابن تیمیہ کا اپنا موقف کیا ہے؟ اہل اصول کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب کسی امام کی روایت اس کی رائے سے متصادم ہو تو روایت کو رائے پر ترجیح دی جائے گی اور وہی اس کے موقف کی حقیقی نمائندگی کرے گی، کیونکہ ائمۂ اعلام میں سے ہر امام نے اس شخص سے برأت کی ہے جو دلیل کے بغیر اس کی تقلید کرتا ہے۔

''مجموعہ رسائل فی السفور والحجاب'' مطبوعہ ریاض صفحہ ۵ پر ہے کہ ''زینت ظاہرہ کے بارے میں ابن مسعود اور ابن عباس اور مجاہد کی مانند ابن عباس کے موافقین کے اقوال فقہا کے درمیان وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں کہ آیا اجنبی عورت کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بغیر شہوت کے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ ابوحنیفہ اور شافعی کا مذہب ہے اور امام احمد کا ایک قول بھی۔ ایک قول ہے کہ جائز نہیں۔'' ظاہر ہے ابن تیمیہ کی تصریح کے مطابق ہم مجاہد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سے ابن عباس کی روایت کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ جمہور حنابلہ نے امام احمد کے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، حقیقت کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام احمد کا یہ قول قابل عمل نہیں، اسی لیے اس کی تاویل کے لیے ''باب الحیل'' میں پناہ لینی پڑی۔ کون سی مسلمان عورت چہرہ ڈھانپ کر نماز ادا کرتی ہے۔ نماز کے اندر اور باہر کا الگ ستر کتاب وسنت کے منافی اور 'ستر العورۃ' کے اس فلسفہ سے متصادم ہے کہ یہ ستر عادتاً اور عبادتاً ایک ہوگا۔

صاحب مضمون نے سعودی فقہا کے جو دو ایک حوالے دیے ہیں، ان کی خرقی، ابن ہبیرہ، ابن قدامہ، علی بن سلیمان احمد المرداوی اور مفتی الحنابلہ موسیٰ الحجازی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔

امام احمد بن حنبل کے دوسرے قول کے سلسلہ میں ایک اور حوالے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جو صاحب مضمون کے علم میں نہیں، جس کی طرف ابن رشد نے ''بدایۃ المجتہد'' (۱:۸۳) میں لکھا ہے: ''ابوبکر بن عبدالرحمان اور احمد کا مذہب ہے کہ عورت ساری کی ساری ستر ہے۔'' ابن رشد نے جمہور علما اور ابوحنیفہ کا مسلک بیان کرنے کے بعد اس قول کو بطور شاذ قول پیش کیا ہے۔ امام نووی نے ''المجموع'' (۳:۱۷۴) میں کہا ہے کہ ماوردی اور متولی نے ابوبکر بن عبدالرحمان تابعی سے روایت کی ہے کہ عورت کا سارا بدن ستر میں شامل ہے۔ امام ذہبی ''التنقیح'' (۱:۲۰۹) میں کہتے ہیں کہ ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث بن ہشام کا قول ہے کہ عورت کی ہر چیز، یہاں تک کہ ناخن بھی ستر میں شامل ہیں۔ اس شاذ قول کا جواب میں چوتھی قسط میں دے چکا ہوں، یہاں اس کا تکرار بے محل نہ ہوگا۔

امام ابن عبدالبر ''التمہید'' (۶:۳۶۴) میں فرماتے ہیں: ''عورت ساری کی ساری سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر ہے۔ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔'' پھر وہ ان نصوص سے خروج کرنے والے ایک آدمی کے قول کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث کا قول ہے کہ عورت کی ہر چیز یہاں تک کہ ناخن بھی ستر میں شامل ہیں۔ ابوبکر کا یہ قول اہل علم کے اقوال کے خلاف ہے، کیونکہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت اس حالت میں نماز ادا کرے گی، جبکہ اس کے ہاتھ اور چہرہ کھلے ہوں گے۔ یہ دونوں اعضا زمین کو چھوئیں گے۔ ان کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ نماز پڑھتے وقت نہ نقاب اوڑھے گی اور نہ دستانے پہنے گی۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ ستر میں شامل نہیں۔ ابن قدامہ نے ''المغنی'' (۱:۶۳۹) میں ابوبکر کے اس قول کی اصولی لحاظ سے تکذیب یہ کہہ کر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول 'المراۃ عورۃ' (عورت ستر ہے) عام ہے جس کی تخصیص اللہ کا قول 'الا ما ظھر منھا' (۲۴:۳۱) اور اس سلسلہ میں وارد ہونے والی ہر حدیث کرتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے عادتاً اور عبادتاً کی اصطلاح کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ ستر کے بارے میں سورۂ نور کی آیت نص کا درجہ رکھتی

ہے۔اس آیت میں نماز کے اندر اور نماز سے باہر، ہر قسم کے ستر اور اس کے استثنا کا ذکر ہے۔جیسا کہ ''شرح المنہج'' پر علامہ الشیخ سلیمان الجمل نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سورۂ نور کی یہ آیت نماز کے بارے میں ہے۔تعصب کا یہ حال ہے کہ قرآن کی تحریف سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

شوافع اور چہرے کا پردہ

صاحب مضمون نے چھوٹتے ہی غلط بات کہی ہے کہ جمہور شوافع کے نزدیک چہرہ عورت کے ستر میں داخل ہے۔ میں جو حوالے پیش کروں گا، وہ امام شافعی اور ان کے فقہ کو سمجھنے والے متقدمین فقہا کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ جو صاحب مضمون کے قول کی تکذیب کے لیے کافی ہیں۔مضمون نویس نے اعتراف کیا ہے کہ امام شافعی کا قول ہے کہ چہرہ عورت کے ستر میں داخل نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کہ جمہور شوافع اپنے امام کے مخالف ہیں عجیب سا لگتا ہے۔ان پر واجب تھا کہ وہ بتاتے کہ شافعی فقہا نے کیوں اپنے امام کی مخالفت کی ہے؟ اور کہاں کی ہے؟ یہ تو بتایا نہیں، محض قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے غلط بات کہہ دی ہے۔

امام شافعی کی مشہور کتاب ''کتاب الأم'' ہے۔صاحب مضمون نے حالت احرام میں 'سدل' کے بارے میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ وہ اس کتاب کے 'ستر العورۃ' کے بارے میں حوالہ کو پھلانگتے ہوئے، اس حوالہ تک کیسے پہنچ گئے، حالاں کہ یہ حوالہ پہلی جلد میں موجود ہے اور انھوں نے دوسری جلد کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ موضوع زیر بحث کے ساتھ خاص ہے، جبکہ ان کے حوالہ کا نفس مضمون سے براہ راست تعلق نہیں۔کیا ایسا سہواً ہوا ہے یا دیدہ و دانستہ؟

''کتاب الأم'' (۱:۱۸۱) میں امام شافعی (۲۰۴ھ) کا قول ہے کہ ''عورت پر واجب ہے کہ وہ نماز میں اپنی ہتھیلیوں اور چہرے کو چھوڑ کر سارا بدن چھپائے۔'' ''کتاب الأم'' کے محقق محمود مطرجی نے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ ''بیہقی نے عورت کے ستر کے بارے میں حفص بن غیاث انھوں نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز انھوں نے سعید بن جبیر اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' سے مراد ہتھیلیاں اور چہرہ ہے۔ اور ابن عمر سے روایت ہے کہ زینت ظاہرہ چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔اسی مفہوم کی روایت عطاء بن ابی رباح اور سعید بن جبیر سے ہے اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔''

فقہ شافعی میں ''کتاب الأم'' کے بعد ابو اسحاق شیرازی (۴۷۴ھ) کی ''المہذب'' کا مقام ہے۔اس کتاب (۱:۲۱۸)

میں ہے: ''رہی آزاد عورت کی بات تو چہرے اور ہتھیلیوں کو چھوڑ کر اس کا سارا بدن ستر ہے، کیونکہ اللہ کا قول ہے: 'الا ما ظهر منها' (سوائے اس زینت کے جو ظاہر رہے)، ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے مراد عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں اور کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں عورت کو نقاب اوڑھنے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے، اگر یہ اعضا ستر میں شامل ہوتے تو ان کو چھپانا حرام قرار نہ دیا جاتا اور کیونکہ خرید وفروخت کے لیے چہرے کو اور لین دین کے لیے ہاتھوں کو کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے، اسی لیے اللہ نے ان کو ستر میں شامل نہیں کیا۔''

میرے خیال میں ''المہذب'' میں واضح کر دیا گیا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے کھلا رکھنے کا ماخذ کتاب وسنت ہے اور ان کے کھلا رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ خرید وفروخت اور لین دین میں بے جا دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ معاشرے کی ایک فعال رکن کی حیثیت سے زندگی گزارے۔ صاحب مضمون اگر اب بھی اپنی بات پر اڑے رہیں تو:

بریں عقل و دانش بباید گریست

''الوجیز فی مذہب الامام شافعی'' امام ابوحامد غزالی (۵۰۵ھ) کی فقہ شافعی سے متعلق کتاب ہے۔ اس میں (۱:۴۸) لکھا ہے: ''آزاد عورت کا سارا بدن بجز چہرے اور ہاتھوں کے بند تک ستر ہے۔'' مقام حیرت ہے کہ صاحب مضمون نے نفس مضمون کے بارے میں فقہ کی کتاب کو چھوڑ کر ''احیاء علوم الدین'' کا حوالہ دیا ہے جو حکمت عبادات اور فلسفۂ اخلاق کی کتاب ہے۔ ''فتح العزیز شرح الوجیز'' امام ابوقاسم محمد الرافعی الشافعی (۶۲۳ھ) کی کتاب ہے۔ اس کے صفحہ (۴:۸۷) پر لکھا ہے: ''عورت اگر آزاد ہو تو چہرے اور ہاتھوں کے سوا اس کا سارا بدن ستر میں شامل ہے، کیونکہ اللہ کا قول ہے 'الا ما ظهر منها'۔ (۲۴:۳۱) مفسروں کا قول ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، بلکہ دونوں کا اندر اور باہر بند تک ستر سے خارج ہے۔''

امام محی الدین شرف النووی (۶۷۶ھ) کی کتاب ''المجموع''، ''المہذب'' کی شرح ہے اور فقہ شافعی کے اہم مصادر میں سے ہے۔ وہ اس (۳:۱۷۰) میں فرماتے ہیں کہ ''یہ تفسیر (جس کا مہذب میں حوالہ ہے) ابن عباس سے بیہقی نے روایت کی ہے۔ حضرت عائشہ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں اس کے علاوہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ نقاب اور دستانوں کی ممانعت والی حدیث بخاری نے ابن عمر سے روایت کی ہے۔''

پھر وہ صفحہ (۱۷۴) پر عنوان باندھتے ہیں ''عورۃ' (ستر) کے بارے میں علما کے مسالک۔ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ ہمارے مذہب (شافعی) کا مشہور قول یہ ہے کہ مرد اور لونڈی کا ستر ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے اور آزاد عورت کا ستر چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا سارا بدن ہے۔ مالک اور علما کی بڑی جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ یہ امام احمد سے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایک روایت ہے۔ ابوحنیفہ کا قول ہے کہ پاؤں بھی ستر میں شامل نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ چہرے اور ہتھیلیوں کو چھوڑ کر سارا بدن ستر ہے ان میں اوزاعی اور ابوثور بھی شامل ہیں۔ ابوحنیفہ، ثوری اور مزنی کا قول ہے کہ قدم بھی ستر میں شامل نہیں۔ امام احمد کا ایک قول ہے کہ فقط چہرے کے سوا سارا بدن ستر میں شامل ہے۔ ماوردی اور المتولی نے ابوبکر بن عبدالرحمان تابعی سے روایت کی ہے کہ عورت کا سارا بدن ستر میں شامل ہے۔'' امام نووی نے تفصیل کے ساتھ اپنا اور تمام ائمہ کا مسلک بیان کر دیا ہے، مگر انھوں نے امام احمد کے اس قول کا ذکر تک نہیں کیا کہ عورت کا سارا بدن ستر ہے۔

روضۃ الطالبین (۱:۳۸۸) بھی امام نووی کی تصنیف ہے۔ وہ اس میں فرماتے ہیں: ''ستر کو چھپانا نماز سے باہر خلوت اور جلوت میں بھی واجب ہے۔'' اس کتاب کے صفحہ (۱:۳۸۹) پر ہے: ''جہاں تک آزاد عورت کا تعلق ہے۔ چہرے اور ہتھیلیوں کے اندر اور باہر کے حصے کو ہاتھ کے جوڑ (بند) تک کے سوا عورت کا سارا بدن ستر ہے۔''

امام نووی کی کتاب ''منہاج الطالبین'' کی شرح شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے ''شرح المنہج'' کے نام سے کی ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ''آزاد عورت کا ستر چہرے اور دو ہتھیلیوں کے ظاہر و باطن ہاتھ کے جوڑ تک کے سوا سارا بدن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول 'الا ما ظهر منها' ہے، جس کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی گئی ہے۔ اور یہ اس لیے بھی ستر نہیں ہیں، کیونکہ ان کو کھلا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

شیخ محمد شربینی الخطیب نے ''منہاج'' کی شرح ''مغنی المحتاج'' کے نام سے لکھی ہے۔ وہ ''منہاج'' کے متن (آزاد عورت کا چہرہ سوا چہرے اور ہتھیلیوں کے) کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''انگلیوں کے سروں سے لے کر ہتھیلیوں کا اندر اور باہر ہاتھ کے جوڑ تک، کیونکہ اللہ کا قول ہے 'الا ما ظهر منها'، ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ ایک قول ہے کہ صرف چہرہ ہے۔ پاؤں کا اندرونی حصہ ستر نہیں۔ مزنی کا قول ہے کہ پاؤں ستر میں شامل نہیں۔''

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

بنی اسماعیل کی تولیت بیت اللہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت اسماعیل کی شادی ہاجرہ کے قبیلہ بنو جرہم میں ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے معتقد تھے۔ اس قبیلہ کے لوگ مکہ میں بھی آ کر آباد ہو گئے۔ حضرت ابراہیم کو ملنے والی بشارت کے مطابق اسماعیل کی نسل میں خوب اضافہ ہوا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن سے بارہ قبیلے وجود میں آئے اور وہ بیٹے ان قبیلوں کے سردار بنے۔ حضرت اسماعیل تو بیت اللہ کی خدمت کے لیے اللہ کی نذر تھے ہی، ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی یہ ذمہ داری نبھائی۔ ان کے بڑے بیٹے نابت کے پاس بیت اللہ کے انتظام کی ذمہ داری رہی۔ نابت اور دوسرے بیٹے قیدار کے بارے میں قدیم صحیفوں میں یہ شہادت موجود ہے کہ:

''قیدار کی سب بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نابت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میرے مذبح پر مقبول ہوں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو جلال بخشوں گا۔'' (یسعیاہ ۶۰: ۷)

ظاہر ہے کہ پرشوکت گھر سے مراد بیت اللہ ہے۔ لہٰذا قیدار اور ان کی اولاد نے بھی اس عظیم گھر کی پاسبانی میں بھرپور حصہ لیا۔ بنو جرہم کا جو تعلق بنی اسماعیل کے ساتھ تھا، اس کی بدولت وہ بھی بیت اللہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کی معاونت کرنے لگے۔

بیت اللہ کا انتظام غیر بنی اسماعیل میں

جوں جوں بنی اسماعیل کی تعداد میں اضافہ ہوا وہ مکہ سے نقل مکانی کرنے لگے۔ وہ جہاں جہاں گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت دی اور جا بجا ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ میں بنو جرہم نے طاقت پکڑی اور بالآخر بیت اللہ کے مجاور بن بیٹھے۔ ان کا تسلط بے حد طویل عرصہ تک رہا۔ شروع میں تو انھوں نے بیت اللہ کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان سے کعبہ کے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگی۔ انھوں نے اس مرکز توحید کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ یہاں لوگ جو نذریں پیش کرتے ان کو یہ خود ہڑپ کرنے لگے۔ زائرین کی خدمت کا جذبہ مضمحل ہو گیا۔ ظلم و زیادتی کر کے زائرین سے مال بٹورنے کے طریقے وضع کر لیے گئے۔ انھوں نے خانہ کعبہ کی حلت و حرمت کی حدود کو بھی ملحوظ نہ رکھا۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے مکہ کے قریب آباد دو قبائل بنو بکر اور بنو خزاعہ نے مل کر جرہم کو مکہ سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں پارٹیوں میں جنگ ہوئی جس میں جرہم کو شکست ہوئی اور وہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے بیت اللہ کے پاس واقع کنویں زم زم میں اپنا اسلحہ اور دوسرا سامان پھینک کر کنویں کو بھر دیا اور اس کا نشان مٹا دیا۔

بنو بکر اصلاً خانہ بدوش تھے، اس لیے اب بیت اللہ کا انتظام عملاً بنو خزاعہ کے پاس آ گیا اور تولیت کعبہ باپ سے بیٹے کو منتقل ہونے لگی۔ طریقہ ہے کہ اصلاح کے مقصد سے انقلاب لانے والے پہلے پہل بڑے خلوص نیت اور وفا شعاری کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور وہ پہلوں ہی کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے بھی وہی حرکتیں شروع کر دیں جو بنو جرہم نے کی تھیں۔ اسی قبیلہ کا ایک بدبخت آدمی عمرو بن لحی خزاعی بیت اللہ میں مظاہر شرک کو داخل کرنے کا ذریعہ بنا۔ وہ مختلف ممالک میں آتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شام کے سفر سے واپس آیا تو اپنے ساتھ عمالقہ کا بت ہبل بھی لایا۔ اس کو اس نے عین کعبہ کے پاس نصب کیا اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت کا نقش بٹھایا۔ چنانچہ لوگ اہم امور میں اس بت سے برکت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جب ایک مرتبہ کعبہ کے تقدس کو داغ دار کر دیا گیا تو پھر مزید بتوں کا اس میں داخلہ آسان ہو گیا۔ ہوتے ہوتے اس مرکز توحید کو مرکز شرک میں تبدیل کر دیا گیا۔

بیت اللہ کے انتظام کی بازیافت

قصی بن کلاب

حضرت اسماعیل کی نسل میں ایک بڑا نام عدنان کا آتا ہے جس کی نسل کا شجرۂ نسب محفوظ ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں اس نسل میں کنانہ کی اولاد نمایاں ہوئی جو مکہ میں مقیم تھے۔ کنانہ کا پڑپوتا ایک نہایت باصلاحیت سردار فہد بن مالک تھا۔ اس کی اولاد قریش کہلائی۔ فہد کی چھٹی پشت میں قصی بن کلاب نے بے حد شہرت پائی۔ اس نے کعبہ کے خزاعی متولی حلیل بن حبشیہ کی بیٹی سے شادی کی اور امور بیت اللہ میں شریک ہو گیا۔ حلیل کی وفات پر قصی نے تمام انتظام خود سنبھال لیا۔ خزاعہ نے اس کی مخالفت شروع کر دی تو قصی نے اپنے خاندان بنو کنانہ کے علاوہ دوسرے بنی اسماعیل سے مدد طلب کر لی۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ وہ مکہ کے قریب آ کر بسیں۔ چنانچہ بہت سے قبائل مکہ میں آ گئے جس کے نتیجہ میں قریش کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ اس خدمت کی بنا پر قصی کو مجمع کا لقب ملا۔

بالآخر فریقین کے درمیان جنگ کی نوبت آئی جس میں کافی نقصان ہوا۔ اس نزاع کے فیصلہ کے لیے یعمر بن عوف کو ثالث مانا گیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ قصی بن کلاب خزاعہ کی نسبت تولیت کعبہ کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ نیز خزاعہ اور بنو بکر نے قریش کے جو خون کیے ہیں ان کو ان کا خون بہا دینا ہو گا۔ البتہ قصی کے ہاتھوں جو خون ان کے ہوئے ہیں ان کا خون بہا نہیں دینا ہو گا۔ اس طرح وراثت ابراہیم اور عرب کی مذہبی سیادت اس قبیلہ کے ہاتھ میں آ گئی جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا اور جس کا تولیت کعبہ کا حق مقدم تھا[1]۔

قصی کے ذہن رسا نے مکہ میں ایک شہری ریاست قائم کرنے کا خاکہ تیار کیا تا کہ قریش کے تمام خان وادوں میں اس ریاست کی ذمہ داریاں تقسیم کر دی جائیں اور وہ سب محسوس کریں کہ ان میں سے ہر خان وادہ کو اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کو امور ریاست میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے تا کہ وہ شہر کے نظم و نسق میں برابر کا شریک رہے۔ اس مقصد سے قصی نے قریش کی تمام شاخوں کے لیے الگ الگ محلے مقرر کیے اور ان کے سرداروں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت قائم کی۔ ہر شاخ کا سردار اس مجلس کا رکن تھا۔ لیکن یہ بات ملحوظ رکھی جاتی کہ سردار چالیس برس سے کم عمر کا نہ ہو۔ اس مجلس مشاورت کی سربراہی قصی کے پاس تھی اور اس کی اہم ذمہ داری انتظام بیت اللہ، صلح و جنگ، اہم امور مملکت اور شادی بیاہ کے فیصلے کرنا تھا۔ مجلس کے اجتماعات کے لیے اس نے دارالندوہ قائم کیا جس کا دروازہ بیت اللہ کی

---

[1] الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، دار الفکر بیروت ۱/ ۴۴۔

طرف کھلتا تھا۔قصی نے بیت اللہ کی ذمہ داریاں خود سنبھالیں۔لہٰذا وہ مکہ کا حاکم اور تمام عربوں کا روحانی پیشوا بھی تھا۔اس منصب کی بدولت اس کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔شہری ریاست کے کئی محکمے تھے۔ان میں حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی وحفاظت) اور سدانہ (کلید برداری) کا تعلق خانہ کعبہ سے تھا۔سقایہ (پانی پلانا) اور رفادہ (کھانے کا بندوبست کرنا) زائرین بیت اللہ کی خدمت کے محکمے تھے۔اللواء (پرچم)، قیادہ (جنگ میں قیادت) اور قبہ (چھاؤنی کا انتظام) کا تعلق حالت جنگ سے تھا۔مختلف خان وادوں میں تقسیم کار سے شہر کا نظم ونسق بہتر ہو گیا،مختلف خاندانوں کی اہمیت بڑھ گئی اوران کے درمیان وحدت پیدا ہوگئی۔قصی نے باہر سے آنے والے تاجروں سے عشر لینا شروع کیا جو مکہ کی ثروت کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔حج وعمرہ کے انتظام میں بھی اس نے کئی اصلاحات کیں۔حجاج کی بہبود کے لیے اس نے قریش کو یہ شعور دیا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے گھر کے خادم اور حجاج کو اللہ کے مہمان سمجھیں۔اس نے پانی کی فراہمی کا نظام بہتر کیا اور قریش کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ چندہ جمع کر کے ایام حج میں حاجیوں کی ضیافت کیا کریں۔

قصی نے مرتے وقت انتظام ریاست اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کے حوالہ کر دیا حالانکہ اس کے چار بیٹوں میں سے دوسرا بیٹا عبد مناف سب سے زیادہ باصلاحیت تھا اور والد کی زندگی ہی میں دوسروں پر فوقیت پا گیا تھا۔لوگوں کے اندر اس کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔باپ کے فیصلہ کے مطابق بھائیوں نے عبدالدار کی سیادت تسلیم کر لی،لیکن ان کی اولادیں اس پر مطمئن نہ تھیں۔عبدالدار کے مرنے پر عبد مناف کے بیٹوں نے دادا کے فیصلہ کے خلاف آواز بلند کی اور محکموں کی منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کیا۔اس کے نتیجہ میں جو بحث چلی تو قریش دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم اور بنو حارث عبد مناف کے بیٹوں کے مطالبہ کے حق میں تھے۔انھوں نے ایک ساتھ رہنے کی قسم کھائی اور مطیبین کہلائے۔عبدالدار کی اولاد کا ساتھ بنو سہم، بنو عدی، بنو مخزوم اور بنو جمح نے دیا۔یہ احلاف کہلائے۔قریب تھا کہ دونوں گروپوں میں جنگ برپا ہو جائے کہ بعض لوگوں نے درمیان میں پڑ کر اس بات پر سمجھوتا کرا دیا کہ بنو عبدالدار کے پاس ندوہ، حجابہ اور لواء کے محکمے رہیں، جبکہ بنو عبد مناف کو سقایہ اور رفادہ کا انتظام دے دیا جائے۔اگرچہ معاملہ صلح صفائی سے طے ہو گیا،لیکن مذکورہ خاندانوں کا میلان بعد میں بھی ایک دوسرے کی طرف مطیبین اور احلاف کی تقسیم کے مطابق رہا۔

ہاشم بن عبد مناف

عبد مناف کے بعد قبیلہ کی سیادت عبد شمس کو ملی،لیکن وہ زیادہ تر سفر میں رہتا اور مالی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔لہٰذا عملاً

اس کی ذمہ داریاں عبدمناف کے دوسرے بیٹے ہاشم نے ادا کیں۔ وہ بے حد فیاض اور کریم النفس آدمی تھا۔ ایک مرتبہ مکہ میں قحط پڑا تو وہ فلسطین سے آٹا خرید کر لایا اور روٹیاں شوربے میں ڈال کر ثرید سے اہل مکہ کی ضیافت کی۔ ہاشم نے حجاج کی خدمت بڑھ چڑھ کر کی۔ پانی کی فراہمی کا انتظام بہتر بنایا۔ وہ زائرین بیت اللہ کو کھلانے پلانے کا بندوبست اپنی جیب سے کر دیا کرتا۔ ہاشم ایک کامیاب تاجر تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے تعلقات اور اثر ورسوخ کو بروئے کار لا کر شام، فلسطین، عراق، حبشہ اور یمن کی حکومتوں، نیز قبائل عرب سے قریش کے تجارتی قافلوں کے لیے پرامن سفر کے اجازت نامے حاصل کیے۔ مطلب بن عبدمناف نے نجاشی سے اجازت نامہ حاصل کیا، نوفل بن عبدمناف نے شاہ ایران کسریٰ سے سہولتیں حاصل کیں۔ خود ہاشم نے شاہ روم قیصر سے قریش کے تجارتی سفروں کے لیے امن و حفاظت کے پروانے لیے[۲]۔ ان بھائیوں کی تگ ودو کے نتیجہ میں قریش کو ایک ایسی سہولت ملی جو دوسرے قبائل عرب کو حاصل نہ تھی۔ دوسرے قبائل کو غیر قبائل کے علاقہ میں سے گزرنا ہوتا تو وہ پہلے ایک ٹیکس ادا کرتے۔ اس کے برعکس قریش کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ کچھ خرچ کیے بغیر قبائل عرب یا مذکورہ حکومتوں کے علاقوں میں سے گزر جائیں۔ ان کا پیشہ چونکہ تجارت تھا لہٰذا محفوظ سفر کی سہولت میسر آنے کے بعد ان کا ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق مال تجارت خود یا اپنے اہل کاروں کے ذریعے سے منڈیوں میں بھیج سکتا تھا۔ جن لوگوں کے پاس اپنا سرمایہ نہ ہوتا وہ دوسروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے اور اہل مکہ، حتیٰ کہ ان کی خواتین بھی، مکہ میں رہتے ہوئے تجارت کرتے اور منافع کماتے۔ قریش کا معمول تھا کہ وہ موسم سرما میں یمن و حبشہ اور موسم گرما میں فلسطین اور شام کا قصد کرتے۔ لوگ ان کو بیت اللہ کے خادم، اس کے متولی اور حجاج کے ہمدرد سمجھ کر ان سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ یہ سفر اہل مکہ کی خوش حالی اور دولت وثروت کا اہم ذریعہ تھے۔ قرآن نے قریش کے لیے اس غیر معمولی سہولت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ. (قریش ۱۰۶: ۱-۴)

”قریش کو اپنی وابستگی کے سبب سے، یعنی اس وابستگی کے سبب سے جو ان کو موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے ہے، چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک میں کھلایا اور خوف میں امن بخشا۔“

یعنی قریش کو چونکہ یہ سہولت بیت اللہ کی تولیت کے باعث حاصل ہوئی ہے تو اس کا حق یوں ادا ہو سکتا ہے کہ وہ اس گھر کے رب ہی کی عبادت کریں اور شرک سے اجتناب کریں۔

۲؎ الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، دار الفکر بیروت ۱/۵۱۔

عبدالمطلب بن ہاشم

ہاشم نے یثرب کے قبیلہ بنونجار میں ایک باحیثیت خاتون سے شادی کی جس نے یہ شرط لگائی کہ وہ اپنے معاملات کی نگرانی کے لیے یثرب ہی میں رہے گی۔ اس خاتون کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ معاہدہ کے مطابق یہ بچہ ہاشم کو اس کی ماں کے پاس چھوڑنا پڑا۔ جب ہاشم کا انتقال ہوا تو اس کے بھائی مطلب نے یثرب جا کر اس کی بیوہ سے یہ مطالبہ کیا کہ بچے کی پرورش کرنے کے لیے اس کو مکہ میں بھیجے تا کہ وہ خاندان کی روایات کے مطابق تربیت پا سکے۔ ماں نے بڑی مشکل سے یہ مطالبہ تسلیم کیا اور بچے کو اس کے چچا کے حوالے کر دیا۔ مطلب مکہ پہنچا تو لوگوں نے بچے کو اس کا زرخرید غلام سمجھا اور اس کو عبدالمطلب کہہ کر پکارا۔ حقیقت کی وضاحت ہو جانے کے باوجود یہی نام شہرت پا گیا اور اصل نام شیبہ نظر انداز ہو گیا۔ ہاشم کے بعد مطلب بن عبد مناف کے پاس سقایہ اور رفادہ کے محکمے تھے۔ یمن کی طرف ایک تجارتی سفر میں اس کا انتقال ہو گیا تو بنو ہاشم کی سرداری کا منصب اور رفادہ اور سقایہ کی ذمہ داریاں عبدالمطلب کو ملیں[۳]۔

عبدالمطلب کے دور کا اہم واقعہ چاہ زم زم کی بازیافت ہے جس کو بنو جرہم بیت اللہ کے معاملات سے بے دخلی کے بعد بند کر کے بے نشان کر گئے تھے۔ یہ کنواں اگرچہ بیت اللہ کے بالکل ساتھ تھا، لیکن امتداد زمانہ کے باعث لوگ اس کا محل وقوع بھول گئے تھے۔ روایات کے مطابق عبدالمطلب نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک خاص مقام پر کنویں کی کھدائی کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس خواب کو اشارۂ غیبی سمجھ کر قریش سے اس کا تذکرہ کیا اور کھدائی میں ان سے مدد طلب کی۔ قریش نے اس کو کار عبث سمجھا اور ان سے تعاون نہ کیا۔ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حارث کو ساتھ لے کر خود کھدائی شروع کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد بنو جرہم کی دفن کی ہوئی تلواریں برآمد ہو گئیں۔ اب قریش متمنی ہوئے کہ وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہو جائیں، لیکن عبدالمطلب نے اس مرحلہ میں ان کی حصہ داری تسلیم نہ کی اور خود ہی کنواں کھودا۔ مدت ہائے دراز کے بعد پھر سے حجاج کو اس مبارک کنویں کا پانی پینا نصیب ہوا۔

کتب سیرت کی روایات کے مطابق عبدالمطلب کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ چاہ زم زم کی کھدائی میں قریش کے دوسرے خانوادوں نے ان کی مدد نہیں کی۔ انھوں نے نذر مانی کہ میرا رب اگر دس بیٹے مجھے عطا کر دے تو میں ایک بیٹے کی قربانی اس کی راہ میں کر دوں گا۔ یہ نذر قبول ہوئی اور ان کے دس بیٹے پیدا ہوئے۔ جب یہ جوان ہوئے تو باپ نے سب کو جمع کر کے اپنی نذر سے آگاہ کیا اور وہ اس پر عمل کرنے پر تیار ہو گئے۔ عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کے پاس

۳؎ الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، دارالفکر بیروت ۱/ ۵۴۔

www.javedahmadghamidi.com

بیٹوں کے نام کا قرعہ ڈالا جو چھوٹے بیٹے عبداللہ پر نکلا۔ عبدالمطلب عبداللہ کو ساتھ لے کر قربان گاہ کو چلے تو قریش مزاحم ہوئے کہ بیٹے کی قربانی سے عرب میں ایک غلط رسم چل پڑے گی جس کو روکنا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ انھوں نے عبدالمطلب سے مطالبہ کیا کہ وہ یثرب کی مشہور کاہنہ سے مشورہ کر کے بیٹے کا فدیہ دے دیں۔ قریش کے کچھ لوگ یثرب گئے تو کاہنہ نے یہ تجویز دی کہ خانہ کعبہ کے پاس دس اونٹ اور عبداللہ کے مابین قرعہ ڈالا جائے۔ اگر قرعہ عبداللہ پر نکلے تو پھر بیس اونٹوں پر قرعہ ڈالا جائے۔ دس دس اونٹ کا اضافہ اس وقت تک کیا جائے جب تک اونٹوں پر قرعہ نہیں نکلتا۔ جب یہ عمل کیا گیا تو عبداللہ کا فدیہ سو اونٹ ٹھہرا۔ یہ جانور ذبح کیے گئے اور ان کا گوشت مکہ کی آبادی میں تقسیم کر دیا گیا۔

عبدالمطلب ہی کی سرداری کے زمانہ میں یمن کے ایک متعصب عیسائی حکمران ابرہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کے ناپاک ارادہ سے ایک لشکر جرار کے ساتھ حجاز میں پیش قدمی کی۔ حملہ آور لشکر کے ساتھ ہاتھی بھی تھے۔ عربوں کو ایسے لشکر کے ساتھ جنگ کا تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ قریش اور دوسرے عربوں نے بہترین جنگی پالیسی کے طور پر پہاڑوں میں محفوظ ہو کر گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا تاکہ ابرہہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکیں۔ ابرہہ نے حملہ کی جو اسکیم بنائی تھی اس میں حملہ کے نام نہاد سبب اور وقت کا خاص طور پر انتخاب کیا گیا۔ سبب تو یہ بتایا گیا کہ کسی عرب نے یمن میں نو تعمیر شدہ گرجا کو توہین کے ارادہ سے ناپاک کر دیا ہے لہٰذا اس کا بدلہ عربوں کے مقدس معبد خانہ کعبہ کو ڈھا کر لینا ہے۔ وقت کا انتخاب اس نے یوں کیا کہ جنگی کارروائی کے لیے محترم مہینوں کو چنا۔ اس کا خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ اور خوں ریزی کو جائز نہیں سمجھتے، اس لیے ان کی طرف سے مدافعت نہیں ہوگی۔ اس نے حملہ بھی ان دنوں میں کرنا چاہا جب پورے ملک سے آئے ہوئے حجاج یا تو قربانی میں مصروف ہوتے ہیں یا تھکے ماندے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ نیز ان دنوں میں مکہ عملاً خالی ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کے باشندے بھی بیش تر حج کی مصروفیتوں میں گھروں سے باہر ہوتے ہیں۔ عبدالمطلب کو حملہ کی خبر ملی تو انھوں نے اس موقع پر خانہ کعبہ میں یہ دعا کی کہ:

> ''اے خدا، آدمی اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت فرما۔ دشمن کی صلیب اور اس کی قوت تیری قوت پر ہرگز غالب نہ ہونے پائے۔ اگر تو ہمارے قبلہ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتا ہے تو پھر کر جو تیری مرضی ہے[۴]۔''

ابرہہ کی چال اور پورے منصوبہ کو اللہ تعالیٰ نے خاک میں ملا دیا۔ یمن سے مکہ کو سفر کرتے ہوئے اس کو عرب قبائل

---

[۴] الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، دار الفکر بیروت ۱/۶۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ کے قریب پہنچا تو اہل مکہ اور غیر مسلح حاجیوں نے منیٰ کے پتھروں سے اسلحہ کا کام لیا اور لشکر پر بار بار سنگ باری کر کے اس کے قدم مکہ کی طرف بڑھنے سے روک دیے۔ اس دوران میں قریش نے گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا۔ قریش اور حجاج دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے برابر اپنے رب سے دعا بھی کرتے رہے کہ وہ دشمن کو پامال کرے۔ چنانچہ منیٰ سے متصل وادی محسر میں ابرہہ کی فوج پر سنگ باری کرنے والی ہوا چلی جس نے محسر کو دشمن کے لیے موت کی وادی بنا دیا۔ جھنڈ کے جھنڈ گوشت خور پرندے ان کا گوشت نوچنے کے لیے وادی میں آ گئے اور منیٰ کو لاشوں کے تعفن سے پاک کر دیا۔ اس کے بعد وادی میں سیلاب آیا جو مرنے والوں کے انجر پنجر بہا کر لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تائید سے قریش کی کمزور مدافعت اتنی موثر بنا دی کہ اصحاب فیل کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ انھوں نے اس سے اپنے کیلنڈر کا آغاز کیا اور یہ سال عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہلایا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بنوخزاعہ جب سے خانہ کعبہ کے امور سے بے تعلق ہوئے تھے ان کو اپنی محرومی کا بے حد قلق تھا۔ عبدالمطلب نے اپنی سربراہی کے دور میں بنوخزاعہ کے عمرو بن ربیعہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ باہم مدد و اعانت اور ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہنے کا معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ ان کی اولادوں پر بھی لاگو تھا۔ اس معاہدہ میں بنومطلب بھی شامل ہو گئے، لیکن عبدشمس کی اولاد بنوامیہ نیز نوفل کی اولاد اس معاہدہ سے باہر رہی۔ عبدالمطلب نے اپنے جانشین و وصی زبیر بن عبدالمطلب کو اور انھوں نے ابوطالب کو اس معاہدہ کی پاس داری کی وصیت کی۔ اسی معاہدہ کے مطابق بنوخزاعہ اولاد عبدالمطلب کی بعد میں بھی حمایت کرتے رہے۔ اس طرح مکہ کے جوار میں بسنے والا قبیلۂ خزاعہ ایک بار پھر قریش کے قریب آ کر امور بیت اللہ میں دل چسپی لینے لگا۔

اولاد عبدالمطلب

عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے حارث، زبیر، ابوطالب، ابولہب، عباس، حمزہ اور عبداللہ کو شہرت ملی۔ ان میں سے حارث کا انتقال والد کی زندگی میں ہو گیا۔ عبدالمطلب کی دوسری بیوی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ سے ان کے تین بیٹے تھے۔ زبیر، ابوطالب اور عبداللہ۔ انھوں نے مرض الموت میں دستور کے مطابق سب سے بڑے بیٹے زبیر کو اپنی تمام ذمہ داریاں حوالہ کیں۔ چنانچہ وہ سربراہ خاندان مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں انھوں نے اپنی نیکی اور رحم دلی کا سکہ بٹھایا۔ زبیر اپنے والد کے وصی تھے[5]۔ وہ بنوہاشم کی سربراہی پر تقریباً تیرہ چودہ برس فائز رہے۔ ان کی وفات پر یہ

---

[5] الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، دار الفکر بیروت ۱/۶۱۔

منصب ابوطالب کے حصہ میں آیا۔ابوطالب غریب آدمی تھے۔وہ اپنے بھائی عباس کے مقروض ہوگئے۔قرض ادا نہ ہوسکا تو وہ سقایہ کے منصب سے ان کے حق میں دست بردار ہوگئے۔

عبداللہ کا انتقال عین جوانی میں باپ کے سامنے ہوا۔ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس پیغمبر اعظم کے والد ہوں جن کی بعثت کے لیے ابراہیم خلیل اللہ اور اسماعیل ذبیح اللہ نے دعا کی تھی۔بنی اسرائیل کے انبیا جن کے حق میں پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی قوم سے ان پر ایمان لانے کا عہد لیتے رہے،اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد جن کی آمد کی خوش خبری دی اور ان کے لیے راہ ہموار کی۔یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

گزشتہ زمانہ میں انبیا علیہم السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی جو بڑی نشانیاں بتائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوگی جو بیت اللہ کی پاسبانی کرنے والے ہیں۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک بنی اسماعیل کی شاخ قریش میں اور قریش کی بھی اس شاخ میں پیدا ہوئے جس کے پاس تولیت کعبہ کا منصب تھا۔دوسری نشانی یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ اور اس عظیم رسول کے درمیان کسی رسول کی بعثت نہیں ہوگی تو فی الواقع اس مدت میں کوئی رسول نہیں آیا۔خود بنی اسرائیل،یہود اور نصاریٰ،سب منتظر رہے کہ اس موعود رسول کی بعثت کب ہو کہ ہم اس پر ایمان لائیں۔تیسری نشانی یہ تھی کہ وہ رسول رہتی دنیا کے لیے ہوگا اور اس کے بعد کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوگا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے اب تک دعویٰ تو کئی لوگوں نے کیا کہ وہ نبی ہیں،لیکن نہ وہ اپنے دعویٰ کو سچ ثابت کرسکے،نہ ان کے پاس اس طرح کی وحی کی تعلیم تھی جو نبیوں کے پاس ہوا کرتی تھی،اور نہ ان کے دعویٰ کو دنیا نے قبول کیا۔ان کے علاوہ دوسری نشانیاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح صادق آئیں اس کا بیان آیندہ صفحات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں آئے گا۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب)

ڈاکٹر وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عمر بن خطاب کی تاریخ پیدایش معلوم نہیں، البتہ ہجرت کے وقت ان کی عمر چالیس سال سے کچھ کم تھی۔ اس حساب سے وہ عام الفیل کے ۱۳ سال بعد اور حرب فجار کے ۴ سال بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔ عیسوی حساب سے ان کا سن پیدایش قریباً ۵۸۱ء بنتا ہے۔ وہ قریش کے قبیلہ بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے عدوی کہلاتے تھے۔ یہ قبیلہ بنو ہاشم اور بنو امیہ جیسا مرتبہ نہ رکھتا تھا، البتہ بنوعبد شمس سے ان کا مقابلہ رہتا تھا۔ بنوعدی میں علم وحکمت کا چرچا ہوا تو قبائل میں اٹھنے والے جنگ وامن یا قبائلی مفاخرت کے تنازعات نمٹانے کی ذمہ داری (سفارت مفاخرت) اسے سونپی گئی۔ اس موروثی وزارت پر عمر بھی فائز ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اسلامی مملکت قائم فرمائی تو انھیں ان کے منصب پر بحال فرمایا۔

عمر رضی اللہ عنہ کا شجرۂ نسب یوں ہے: عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزی بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوی۔ عدی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھویں جد مرہ بن کعب کے بھائی تھے، اس طرح کعب پر ان کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ بتوں کی پوجا سے کنارہ کشی کرنے والے زید بن عمرو بن نفیل بھی بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر کے والد خطاب بن نفیل زید بن عمرو بن نفیل کے چچا ہونے کے

ساتھ ماں جائے بھائی بھی تھے، اس لیے کہ ان دونوں کی ماں جیداء پہلے نفیل اور پھر ان کے بیٹے عمرو کے نکاح میں رہی۔ جاہلیت میں ایسی شادیاں عام تھیں، قرآن مجید نے انھیں 'زواج مقت' (گناہ کی شادی) کا نام دے کر حرام کر دیا۔ جب زید نے بتوں کی پوجا اور ان کے چڑھاوے چھوڑے اور لوگوں کو بھی ان کی عبادت سے منع کرنے لگے تو خطاب نے ان کی شدید مخالفت کی اور قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں مکہ سے باہر نکال دیا۔ خطاب نے عربوں کی مشہور جنگ حرب فجار میں بھی شرکت کی۔

خطاب نے کثرت اولاد کی خاطر کئی شادیاں کیں، ان کی ایک زوجہ حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم سے عمر پیدا ہوئے۔ اپنے قبیلے میں ایک ممتاز مقام رکھنے کے باوجود خطاب مال و دولت والے نہ تھے، ایک زمانے میں وہ لکڑیاں ڈھوتے تھے۔ عمر جوان ہوئے تو وہ بھی مکہ کے نواح ضجنان میں اپنے باپ کے اونٹ چرانے لگے۔ عمر کا قد اتنا لمبا تھا کہ کسی بھی مجمعے میں سب سے ممیز نظر آتے۔ رنگ سرخی مائل سفید اور جسم بھرا ہوا تھا۔ دائیں اور بائیں، دونوں ہاتھوں سے ایک طرح کام کر لیتے۔ کشتی اور گھڑ سواری کے شوق ان کو شروع سے تھے، دوڑتے گھوڑے پر اچک کر بیٹھ جاتے۔ پھر شاعری سننے لگے اور ماہر انساب بن گئے۔ ۲۰ سال کے ہوئے تو حج کے موقع پر منعقد ہونے والے بازار عکاظ کے دنگل کی کشتیوں میں حصہ لینا شروع کیا اور ہر بار جیتتے، حاجیوں کی اگلی منزل بازار مجنہ کوچ کرنے سے پہلے گھڑ دوڑ میں حصہ لیتے اور سب کو پیچھے چھوڑ جاتے۔ کئی سال ان کا یہ معمول رہا، ایک سال عکاظ وقت پر نہ پہنچ پائے تو معلوم ہوا کہ انھوں نے تجارت شروع کر دی ہے اور اپنے قبیلے عدی بن کعب کی روایت پر عمل کرتے ہوئے قریش اور بنوثقیف کے مابین ہونے والا تجارتی نزاع نمٹانے میں مصروف ہیں۔ وہاں سے فارغ ہونے پر اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر عکاظ آئے، اپنا سامان تجارت فروخت کیا اور اس میں بھی اول رہے۔

عمر نے سختی اور درشتی اپنے والد سے وراثت میں پائی پھر ان کی پہلوانی نے اسے برقرار رکھا۔ خلیفہ بننے کے بعد انھوں نے دعا مانگی: ''اے اللہ، میں سخت ہوں، مجھے نرم کر دے، میں کمزور ہوں، مجھے طاقت دے، میں بخیل ہوں، مجھے سخی کر دے۔'' اپنے والد کی طرح وہ بھی امیر نہ تھے۔ شام و یمن اور ایران و روم کی طرف تجارتی سفر کرنے سے بھی ان کی غربت میں کمی نہ آئی، شاید ان کا مزاج تجارت سے لگا نہ کھاتا تھا۔ وہ ان سفروں میں مال کمانے سے زیادہ اپنا علم بڑھانے کی سعی کرتے۔ بعثت نبوی کے وقت قریش کے کل ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان میں ایک عمر تھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو عمر نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ ان قریشیوں میں سے تھے جو

صابیوں (اپنے آبائی دین سے نکل جانے والوں) کے سخت خلاف تھے۔ زید بن عمرو، ورقہ بن نوفل، عثمان بن حویرث اور عبداللہ بن جحش جیسے لوگ ان کے نزدیک گردن زدنی تھے، کیونکہ وہ عام لوگوں کو بھڑکانے کی پوزیشن میں تھے۔ ۲۵ برس کا جوان ہونے کی وجہ سے ان کا آبائی دین سے تعصب حد سے بڑھا ہوا تھا۔ بتوں کی پوجا چھوڑنے کی دعوت ایسی تھی کہ انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خوب برا بھلا کہا اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے۔ ان کا ارادہ پختہ تھا کہ بنو ہاشم نے ان کو اس عمل کے برے نتائج سے متنبہ کیا تب وہ باز آئے۔ مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تو ان کا یہ عزم ایک بار پھر عود کر آیا۔ ایک بار عمر نے ایک مسلمان ہو جانے والی لونڈی کو اتنا مارا کہ خود تھک کر بے حال ہو گئے، ابوبکر وہاں سے گزرے تو انھوں نے اس لونڈی کو خرید کر آزاد کیا۔

مشہور روایت یہ ہے کہ عمر بن خطاب نے بعثت نبوی کے چھٹے سال ہجرت سے ۴ سال قبل ذوالحجہ کے مہینے میں اسلام قبول کیا، تب ۴۵ مرد اور ۲۱ عورتیں مسلمان ہوئی تھیں اور عمر ۲۷ برس کے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اسی وقت حبشہ کو پہلی ہجرت ہوئی جس میں قریباً ۹۰ مسلمانوں نے شرکت کی جب کہ ۴۰ مسلمان مکہ رہے۔ اس طرح حساب لگایا جائے تو اس وقت کل مسلمانوں کی تعداد ۱۳۰ بنتی ہے۔ عمر کے مسلمان ہونے کی وجہ ان کی قومی عصبیت بتائی جاتی ہے، وہ دین قریش پر اسلام کی آمد سے پڑنے والی مصیبت کا ازالہ چاہتے تھے کہ ہجرت حبشہ نے ان میں قریش کے تتر بتر ہونے کا شدید احساس پیدا کر دیا۔ ام عبداللہ بنت ابوحثمہ سے ان کی جو گفتگو ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے بکھرنے پر رنجیدہ تھے۔ انھیں اس کا حل یہی سوجھا کہ اسلامی دعوت کے منبع محمد کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیں تاکہ قوم پھر متحد ہو جائے۔ ابوجہل نے اس پر انھیں ۱۰۰ اونٹ اور ۱۰۰۰ اوقیہ چاندی انعام دینے کا وعدہ کیا۔ وہ اپنی تلوار لہراتے ہوئے دار ارقم کو روانہ ہوئے جہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمان مجتمع تھے۔ راستے میں نعیم بن عبداللہ ملے، انھوں نے سمجھایا کہ اگر تم نے محمد کو قتل کیا تو بنوعبد مناف تمھیں جیتا نہ چھوڑیں گے۔ تم اپنے گھر کے معاملات کیوں نہیں سدھار لیتے۔ تمھاری بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔ عمر فوراً واپس پلٹے، بہن کے گھر میں حضرت خباب بن ارت سورۂ طٰہٰ کی تعلیم دے رہے تھے۔ اپنے بہنوئی سے گتھم گتھا ہوئے اور بہن کا سر پھاڑ دیا۔ اس سب کے باوجود ان کے ارادے میں کوئی کمی نہ پا کر بالآخر انھوں نے قرآن کا وہ صفحہ مانگا جو وہ پڑھ رہے تھے۔ آیات قرآنی تلاوت کرنے کی دیر تھی کہ ان کی کیفیت بدل گئی اور رونے لگے۔ حضرت خباب نے اس موقعے کا فائدہ اٹھایا اور انھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا سنا کر دعوت اسلام دے ڈالی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حال ہی میں فرمائی تھی: ''اے اللہ، اسلام کو ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کی تائید عطا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کر۔'' عمر نے فی الفور خدمت نبوی میں پیش ہونے کی خواہش کی۔ حضرت خباب انھیں کوہ صفا کے قریب ایک گھر میں لے آئے۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ صحابہ جمع تھے، ان سب کے سامنے عمر نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسری روایات کے مطابق جو حضرت عمر نے خود بیان کیں، خانۂ کعبہ میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سورۂ حاقہ کی آیات 'انہ لقول رسول کریم و ما ھو بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون ولا بقول کاھن قلیلاً ما تذکرون تنزیل من رب العالمین' ''بے شک یہ ایک بزرگ فرشتے کا (لایا ہوا) کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو اور نہ قول ہے کسی کاہن کا، تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔'' (۴۰۔۴۳) کی تلاوت سن کر ان کا دل پسیج گیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ (مسند احمد)

جب حضرت عمر کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے سچا ہونے کا یقین ہو گیا تو ان کی قومی عصبیت حق کے لیے عصبیت میں بدل گئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ قوم اس نئے دین کے اندر پھر متحد ہو جائے گی۔ حضرت عمر کے قبول اسلام پر آمادہ ہو جانے اور ابوجہل کے کفر پر اصرار کرنے کی ظاہری وجوہ یہ ہیں: ابوجہل بنو عبد شمس میں سے ہونے کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاصمت رکھتا تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنو عبد مناف سے تعلق رکھتے تھے، زمانۂ جاہلیت سے ان دونوں قبیلوں میں باہمی مفاخرت کی کشمکش رہی ہے۔ حضرت عمر کے قبیلے بنو عدی اور بنو عبد مناف کے بیچ ایسا تنافس نہ تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوتے ہی اسلام کی تبلیغ پر کمر بستہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اسلام کی خبر فوری طور پر ابوجہل کو دی پھر جمیل بن معمر جمحی کو جا کر بتایا جو بات پھیلانے میں مشہور تھا۔ اس نے حرم کے باہر کھڑے ہو کر شور مچا دیا کہ عمر صابی ہو گیا، سب لوگ عمر پر پل پڑے اور انھیں پیٹنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر عاص بن وائل سہمی نے ان کو بچایا۔ اسی نے قریش کو خبردار کیا کہ اگر تم نے عمر (رضی اللہ عنہ) کو نقصان پہنچانا چاہا تو میں اس کا ساتھ دوں گا۔ حضرت عمر کی ترغیب پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی دو قطاریں بنا کر کعبہ کو روانہ ہوئے، ایک قطار میں حضرت حمزہ اور دوسری میں حضرت عمر تھے۔ قریش کو ان کے قریب آنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس طرح مسلمان بیت اللہ میں علانیہ نمازیں ادا کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عمر کے اسلام کو ایک فتح قرار دیتے ہیں، ان کے مسلمان ہونے کے بعد قریش کے کئی ایسے افراد نے اسلام قبول کیا جو مسلمانوں کو دی جانے والی اذیتوں سے خوف زدہ ہو کر قبول اسلام سے ہچکچا رہے تھے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ قریش کی ایذا رسانی پھر بڑھ گئی۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کنبے کا مقاطعہ کر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے اسے شعب ابوطالب میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔تین سال کے اس بائیکاٹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرام مہینوں میں مکہ کواترتے ، باہر سے آئے ہوئے حاجیوں کو اپنی دعوت پیش کرتے اور کھانے پینے کی اشیا ذخیرہ کر لیتے ۔ یہ محاصرہ ختم ہوا پھر عام حزن گزرا تو عقبہ کی پہلی اور دوسری بیعتیں ہوئیں ۔حالات کے پیش نظر مسلمان یثرب کو جانے لگے پھر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذن ہجرت ہوا۔اس تمام عرصے میں حضرت عمر کا کیا کردار رہا، تاریخ اس بارے میں یکسر خاموش ہے۔گمان ہے، وہ بھی شدائد برداشت کرتے رہے ہیں۔اس دوران میں ان سے متعلق کوئی واقعہ ذکر نہ ہوا، اس لیے کہ تحمل و برداشت کے اس دور میں ان کی شجاعت وفتوت کا اظہار نہ ہوسکتا تھا۔حضرت عمر بھی ہجرت کرنے والوں میں شامل ہو گئے ، عام خیال ہے ، انھوں نے بھی تمام مسلمانوں کی طرح پوشیدہ طور پر کوچ کیا تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ وہ مکہ چھوڑنے سے پہلے بیت اللہ گئے ،طواف کیا اور قریش کو چیلنج کر کے شہر سے نکلے ۔(ابن عساکر) یہ بات قرین قیاس نہیں لگتی، اس لیے کہ پیغمبر علیہ السلام کا عام فرمان تھا کہ مسلمان خاموشی سے تنہا یا چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہجرت کریں۔قبا پہنچ کر حضرت عمر نے حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر کے گھر قیام کیا جن کا تعلق قبیلۂ بنو عمرو سے تھا۔بعد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وہاں پہنچے تو حضرت عمر آپ کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ پہنچے اور مسجد نبوی اوراس سے ملحقہ حجرۂ رسول کی تعمیر میں حصہ لیا۔آپ کے حکم سے مدینہ میں مواخات قائم ہوئی تو عتبان بن مالک خزرجی عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی بنے۔اگرچہ حضرت ابوبکر، حضرت معاذ بن عفرا اور حضرت عویم بن ساعدہ کے ساتھ عمر رضی اللہ عنہ کی مواخات کی روایتیں بھی موجود ہیں، لیکن وہ قوی نہیں۔انصار ومہاجرین کے اس بھائی چارے نے مشرکوں اور یہودیوں کی عسکری قوت کو گہنا دیا، یہی وجہ ہے کہ یہود مسلمانوں کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مدینہ منورہ میں عمر رضی اللہ کی صلاحیتیں بروے کار آنے کے مواقع بھی فراہم ہو گئے ۔ یہاں ان کی صفت اجتہاد نمایاں ہوئی۔نماز کے لیے مسلمانوں کو بلانے کا طریقہ سوچنا پڑا تو بگل یا سنکھ کی تجویزیں سامنے آئیں، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ناپسند کرتے تھے۔حضرت عمر کی ذمہ داری لگی ،صبح بازار سے دولکڑیاں لا کر ناقوس (سنکھ) بنائیں کہ انھیں خواب آیا، ناقوس نہ بجاؤ، بلکہ نماز کے لیے اذان دیا کرو۔روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید کو بھی ایسا ہی خواب آیا ،ایک فرشتے نے ان سے ناقوس خرید لیا اور کلمات اذان تلقین کیے۔یہودیوں کی سازشوں کا توڑ کرنے اور قریش کو مرعوب کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرایا بھیجنے شروع کیے تو حضرت حمزہ، حضرت

عبیدہ بن حارث، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن جحش کو امیر مقرر کیا اور عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں مقیم رکھنا پسند فرمایا۔ نجران کے عیسائیوں سے عقائد کی بحث چھڑی تو حضرت عمر کی شدید خواہش تھی کہ انھیں فیصلہ کرنے کے لیے بھیجا جائے، کیونکہ یہی سفارت تو ان کا آبائی پیشہ تھا، لیکن پیغمبر علیہ السلام کی نگہ انتخاب ابوعبیدہ بن جراح پر پڑی۔

بدر کے موقع پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے قریش کے تین گنا بڑے لشکر سے جنگ کرنے یا واپس لوٹ جانے پر مشورہ کیا تو حضرت ابوبکر کی طرح حضرت عمر بھی جنگ کا مشورہ دینے والوں میں شامل تھے۔ ان کا آزاد کردہ غلام مہجع بن صالح اس معرکے کا پہلا شہید تھا۔ خود انھوں نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو جہنم واصل کیا۔ جنگ کے خاتمے پر قریش کے ۷۰ افراد مسلمانوں کی قید میں آئے، اکثریت ان کے سرداروں اور زعما کی تھی۔ قیدیوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ انھیں ویسے ہی یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے جبکہ حضرت عمر کا اصرار تھا کہ اللہ کے ان دشمنوں کی گردنیں اڑا دی جائیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا، انھیں مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور پھر ان سے جنگ وقتال کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا تو فیصلہ ہوا کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ فوراً آسمان سے وحی نازل ہوئی: 'تریدون عرض الدنیا واللّٰہ یرید الآخرۃ'، ''تم دنیا کا مال (فدیہ) چاہتے ہو اور اللہ آخرت کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (الانفال ۸: ۶۷) اس طرح حضرت عمر کا موقف درست ثابت ہوا۔

سال گزرا تھا کہ قریش بدر کی جنگ کا بدلہ لینے کے لیے احد میں اکٹھے ہوئے۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنھم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عمامہ اور زرہ پہنائی۔ احد میں ابتدائی فتح ہوئی پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی افواہ پھیلی تو تمام اسلامی لشکر منتشر ہو گیا۔ حضرت عمر بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئے، لیکن جیسے ہی حقیقت کا پتا چلا فوراً پلٹے اور آپ کا دفاع کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ خالد بن ولید پہاڑ کے اوپر سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت عمر اور دوسرے صحابہ نے ان کا حملہ ناکام بنا دیا۔ غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر ایک انصاری اور ایک مہاجر کا پانی پر جھگڑا ہو گیا تو عبداللہ بن ابی نے کہا کہ سرزمین یثرب میں ہمیشہ ہم برسراقتدار رہے ہیں، ہم کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ جو ذلیل ہمارے ہاں پناہ لینے آئے ہیں ہمارے آدمیوں کو طمانچے ماریں، ہم انھیں مدینہ سے نکال باہر کرتے ہیں۔ 'یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منہا الاذل'، ''(منافقین) کہتے ہیں، اگر ہم مدینہ لوٹ کر گئے تو معزز ترین انتہائی ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

گا۔'' (المنافقون۶۳:۸) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک خبر پہنچی، حضرت عمر پاس تھے، انھوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ عباد بن بشر کو کہیں کہ ابن ابی کو قتل کر دے۔ آپ نے جواب میں فرمایا: کتنی بری بات ہے، لوگ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتا ہے۔ رئیس المنافقین کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جنازہ پڑھانے لگے تو عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اسلام کے خلاف اس کی چلی ہوئی چالیں بیان کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تدفین سے فارغ ہوئے تھے کہ یہ آیات نازل ہوئیں: 'و لا تصل علی احد منهم مات ابداً و لا تقم علی قبره'، ''ان (منافقین) میں سے جو مر جائے کبھی اس کی نماز جنازہ نہ پڑھنا اور نہ (تدفین کے لیے) اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔'' (التوبہ ۹:۸۴) یوں عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پھر صحیح ثابت ہوئی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو مکہ بھیجنا چاہا تاکہ قریش کو مسلمانوں کی آمد کے مقصد اور عمرے کے پروگرام کے بارے میں بتائیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ مجھے قریش کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے، کیونکہ بنو عدی میں میری حمایت میں اٹھنے والا کوئی نہیں رہا۔ عثمان رضی اللہ عنہ اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ پھر مسلمانوں اور قریش میں معاہدۂ صلح ہوا، حضرت عمر اس معاہدے کی شرائط پر سخت معترض ہوئے۔ پہلے حضرت ابو بکر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ شدید جذباتی کیفیت میں پوچھا: کیا آپ اللہ کے رسول نہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں؟ اثبات میں جواب ملنے پر کہا، تو کس لیے ہمیں دین میں کم تر حیثیت دی جا رہی ہے؟ اس پر جب آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا اور وہ مجھے ہرگز ضائع نہ کرے گا تو حضرت عمر خاموش ہو گئے۔ یہ واحد موقع تھا جس میں وحی نے حضرت عمر کے موقف کو غلط ثابت کیا۔ بعد میں وہ صدقہ اور صوم وصلوٰۃ کے ذریعے سے اپنی اس جسارت کی معافی مانگتے رہے۔

ہجرت کے بعد اگرچہ کئی سال تک شراب ممنوع نہ ہوئی تھی، لیکن حضرت عمر محسوس کرتے رہے کہ شراب پی کر اپنے ہوش وحواس قائم نہ رکھ سکنا، جن کی بدولت بعض قباحتیں وجود میں آتی ہیں اس لیے شراب نوشی سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَ	''لوگ آپ سے شراب اور جوئے (کے حکم) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیں، ان دونوں (کے

اِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا. (البقرہ۲:۲۱۹)

استعمال) میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑھا ہوا ہے۔''

اس میں اگرچہ شراب کی تحریم نہ تھی۔لیکن اس کا گناہ ہونا واضح کر دیا گیا تھا۔بعض ایسے مسلمان جو رات کو کثرت شراب نوشی کے عادی تھے، ان کے لیے نماز فجر دشوار ہو جاتی ۔عمر رضی اللہ عنہ پھر آئے اور شراب کی اس برائی کے بارے میں حکم معلوم کیا،تب یہ آیت اتری:'یاایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ما تقولون '''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، نماز کے قریب نہ پھٹکو جب تم نے نشہ کیا ہو حتیٰ کہ تمھیں معلوم ہو کہ تم کیا بول رہے ہو۔'' (النساء۴:۴۳) پھر ایک واقعہ ہوا۔ایک انصاری اور ایک مہاجر شراب پی کر اونٹ کا گوشت کھا رہے تھے کہ کسی بات پر ان کا جھگڑا ہو گیا۔انصاری نے اونٹ کی ہڈی پکڑی اور مہاجر کے سر پر دے ماری، اس کا سر پھٹ گیا۔دو قبیلوں میں لڑائی ہوئی تو پھر ایسی صورت حال پیدا ہوئی۔حضرت عمر تیسری مرتبہ یہ قضیہ سامنے لائے کہ شراب تو عقل اور مال کی دشمن ہے۔اب اللہ کا حتمی حکم آ گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَیۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ. اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ وَیَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ. (المائدہ۵:۹۰-۹۱)

''اے ایمان لانے والو، بے شک شراب، جوا، بتوں کے تھان اور فال کے تیر یہ سب ناپاک، شیطان کے کام ہیں، ان (میں سے ہر ایک) سے بچو تا کہ تم فلاح پا سکو۔شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تم میں دشمنی اور نفرت پیدا کرے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے تو کیا تم ان سے باز آؤ گے؟''

عمر رضی اللہ عنہ کو محض عام مسلمانوں کے حالات کی فکر دامن گیر نہ ہوتی تھی ، بلکہ وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی معاملات میں بھی مفید مشورے پیش کرتے ۔امہات المومنین رات کے وقت قضاے حاجت کو نکلتیں تو حجاب نہ ہونے کی وجہ سے پہچانی جاتیں ۔حضرت عمر نے مشورہ دیا، آپ کے پاس برے بھلے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں، اگر اپنی ازواج کو حجاب کا کہہ دیں تو بہتر ہے۔ان کے مشورہ دینے کے بعد آیۂ حجاب نازل ہوئی۔ان کی بیٹی حضرت حفصہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عائشہ سے زیادہ محبت کا تذکرہ کرتیں تو ان کو سمجھاتے اسی طرح جب سیدہ ماریہ کے ہاں ابراہیم کی ولادت ہوئی اور نو مولود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا مرکز بن گیا تو

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ نے دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ اتحاد کر کے حالات میں کشید گی پیدا کر دی، اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ آپؐ انھیں چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ تب عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو اللہ کی ناراضی سے خبر دار کیا۔ دوسری طرف انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح پر آمادہ کیا۔ اہم امور میں دل چسپی رکھنے کی وجہ سے آں حضرت نے انھیں اپنا وزیر قرار دیا۔ آپ انھیں 'یا اخی' (میرا بھائی) کہہ کر بلاتے تو وہ بہت خوش ہوتے۔ آپ ہی نے انھیں فاروق کا لقب بھی عطا فرمایا۔

وہ عمر جو سختی اور درشتی میں مشہور تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو حواس میں نہ رہے اور کہنے لگے کہ منافق سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ وہ تو اپنے رب کے پاس گئے ہیں، اسی طرح جیسے موسیٰ بن عمران چالیس راتوں کے لیے گئے تھے اور مردہ کہلانے کے بعد لوٹ آئے تھے۔ جب ابوبکر نے کہا کہ جو محمد کی بندگی کرتا تھا، جان لے کہ محمد وفات پا گئے ہیں، یہ سن کر حضرت عمر گویا ڈھے گئے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net